ماہنامہ

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ۱۲ آنے
سالانہ آٹھ روپیہ (پیشگی)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد (۸) ———— شمارہ (۵)

ذوالحجہ ۱۳۸۲ھ

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
مینجر ماہنامہ "میثاق"
رحمانپورہ — اچھرہ
لاہور-۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ
منیجر ہفت روزہ ندائے ملت
باغ گونگے نواب لکھنؤ

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ — امین احسن اصلاحی

تدبر قرآن

قارئین کرام سے اپیل

ماہنامہ "میثاق" کے التواء سے جو ذہنی پریشانی قارئین کرام کو اٹھانی پڑی ہے اس میں مدیر محترم اور رسالہ کے دوسرے کارکن بھی برابر کے شریک ہیں۔ اس التواء کے اسباب سے قارئین کو تفصیل سے سابقہ شماروں کے ذریعہ آگاہ کیا جا چکا ہے۔ اب بحمد اللہ رسالہ کی مالی مشکلات کے حل کے لئے ایک انتظامی مجلس تشکیل پا گئی ہے جو رسالہ کی اشاعت اور اس کی افادیت کو بڑھانے کے لئے مختلف پہلوؤں پر کام کر رہی ہے۔

اس موقع پر تمام خریدار حضرات اور رسالہ کے قدردانوں سے بھی اپیل کی جاتی ہے کہ رسالہ کو جلد از جلد خود کفیل بنانے میں ہاتھ بٹائیں تاکہ مجلس انتظامیہ کی یہ کوشش کہ "میثاق" جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو، کامیاب ہو۔

آپ کی سفارش پر آپ کے احباب کو نمونہ کا پرچہ بلاقیمت ارسال کر دیا جائے گا۔ ان کے نام اور پتوں سے اطلاع دیجئے۔

کنوینر مجلس انتظامیہ ماہنامہ میثاق

لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

افسوس ہے کہ میثاق کا یہ شمارہ بھی کئی مہینوں کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے - تاخیر کے اسباب اس مرتبہ بھی کم و بیش وہی ہیں جو اس سے پہلے پیش آ چکے ہیں - پرچہ کے ادارتی اور انتظامی دونوں ہی طرح کے معاملات اب تک بیشتر تنہا میری ہی ذات سے متعلق رہے ہیں اس وجہ سے جب کبھی میں بیمار پڑ گیا ہوں، یا کوئی غیر معمولی مصروفیت مجھے پیش آ گئی ہے، یا کوئی مالی زحمت پیدا ہو گئی ہے تو اس کا اثر پرچے کی اشاعت پر ضرور پڑا ہے۔ اس بار بار کی تاخیر و التوا سے بددل ہو کر میں تو اس بات پر آمادہ ہو گیا تھا کہ اب پرچہ کو بند ہی کر دیا جائے لیکن اس کے قدر دانوں نے میری اس رائے کو پسند نہیں کیا بلکہ اس کو جاری رکھنے ہی پر اصرار کیا البتہ اس کی انتظامی ذمہ داریوں سے انہوں نے مجھے اب بالکل سبکدوش کر دیا ہے تاکہ اس سلسلہ کی کوئی الجھن آئندہ پرچہ کی اشاعت میں تاخیر و التوار کا سبب نہ بن سکے۔ ادارتی فرائض کی انجام دہی میں بھی توقع ہے کہ اب پہلے سے زیادہ تعاون حاصل ہو سکے گا۔ اس لئے کہ حلقہ تدبر قرآن کے رفقا بھی ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹائیں گے —————— بہرحال بظاہر پہلے سے بہتر انتظام کے ساتھ یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ غیب کے حالات کا علم تو صرف عالم الغیب ہی کو ہے لیکن توقع یہی ہے کہ نیا انتظام قابل اطمینان ثابت ہوگا۔ دعا کیجئے کہ ہماری یہ امیدیں پوری ہوں۔ اس موقع پر میرا اخلاقی فرض یہ بھی تھا کہ اس غیر معمولی تاخیر پر اپنی طرف سے شرمندگی کا بھی اظہار کرتا لیکن اس کی ضرورت الحمد للہ سے باقی نہیں رہی ہے کہ رسالہ کے قدردان اپنے طعنوں اور

ملامتوں سے کافی زخمی مجھے کر چکے ہیں۔ میری کوتاہی کے کفارہ کے لئے یہ سزا کافی ہے۔

(۲)

"حلقۂ تدبرِ قرآن" کا ذکر زبان پر آگیا ہے تو چند باتیں اس کے متعلق بھی عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ حلقہ ہمارے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ ہمارا عرصہ سے یہ خیال ہے کہ اب ہمارے ملک میں مذہب کو نئے خطرات سے بچانے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہ ہے کہ ہماری قوم میں دین و دنیا دونوں میں بصیرت رکھنے والے ایسے علماء پیدا ہوں جو جدید ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ہر محاذ پر مذہب کی خدمت کر سکیں۔ یہ بات ہر شخص کو سمجھ لینی چاہیئے کہ مذہب کے ختم ہو جانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ قرآن اور حدیث دنیا سے اُٹھا لئے جائیں بلکہ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے، قرآن و حدیث کا صحیح علم رکھنے والے اُٹھ جائیں گے۔ ادھر ایک عرصہ سے ہماری قوم میں مذہب اسی خطرہ سے دوچار ہے۔ جو پرانے علماء اپنے علم و فضل کے لحاظ سے قابلِ اعتماد تھے ایک ایک کر کے اُٹھتے جا رہے ہیں، جو چند ایک باقی ہیں وہ اب چراغِ سحری کے حکم میں داخل ہیں۔ جن پرانی درسگاہوں سے یہ علماء پیدا ہوئے تھے ان کی کس مپرسی یوں تو ہمیشہ ہی سے قابلِ رحم رہی ہے لیکن اب تو ان کی کس مپرسی اور بے وقعتی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان کا عدم اور وجود دونوں تقریباً برابر ہے۔ ہماری ساری قوم کی توجہ جدید تعلیم اور اس کے ذریعہ سے سرکاری ملازمتوں کی طرف ہو چکی ہے، اب یہ دینی مدارس صرف ان یتیموں اور بیکسوں کی پناہ گاہیں بن کے رہ گئے ہیں جن کے لئے کہیں اور پناہ نہیں ہے۔ ان مدارس کے منتظمین بھی اول تو اتنے جامد ہیں کہ آسانی سے کسی تبدیلی اور اصلاح کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے اور اگر ان میں سے بعض آمادہ بھی ہوتے ہیں تو ان کے وسائل و ذرائع اس قدر محدود ہیں کہ اصلاح و ترقی کی کسی معمولی سے معمولی اسکیم کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

جدید تعلیم کے ادارے جو اس وقت سب کے مرکزِ نگاہ اور ساری قوم کی اُمیدوں اور حوصلوں کی جولانگاہ ہیں، مذہب اور مذہبی تعلیم کے معاملہ میں جو رویہ رکھتے ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ انگریزوں نے ان اداروں کا جو مزاج بنایا تھا ان کا وہی مزاج انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی بدستور قائم ہے۔ ان کے انداز میں تو کوئی قابلِ ذکر تبدیلی ہوئی نہیں ہے، اور جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ ان کے سابق غلامانہ مزاج کو پختہ سے پختہ تر کر دینے کے نقطۂ نظر سے کچھ اہمیت رکھتی ہوں تو رکھتی ہوں لیکن قومی اور اسلامی نقطہ

نظر سے وہ نہ صرف یہ کہ مفید نہیں بلکہ نہایت مضر ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمیں نہایت ہی واضح الفاظ میں ظاہر کر دینی چاہیئے کہ نہ صرف مستقبل قریب میں بلکہ مستقبل بعید میں بھی اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے کہ ان میں کوئی ایسی تبدیلی ہو سکے گی جس سے مذہب یا مذہبی تعلیم کو کوئی فائدہ پہنچ سکے۔

ایسے حالات میں سوچیئے کہ کیا کیا جا سکتا ہے؟ اگر ہم اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو چند سالوں کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو مذہب کی طرف سے کوئی بات دلیل اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکے۔ بے دلیل باتیں کرنے والے تو شاید آج کی طرح کل بھی موجود رہیں لیکن ان کی باتوں میں آج کیا وزن ہے کہ کل ان کے اندر وزن پیدا ہونے کی توقع کی جا سکے۔ میں یہ بات اس اسباب و وسائل کی دنیا کو سامنے رکھ کر عرض کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سامنے رکھ کر نہیں عرض کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تو بلاشبہ کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ وہ چاہے تو سینۂ صحرا سے حباب اُٹھ سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو بھی یاد رکھیئے کہ وہ اپنی قدرت کے یہ کرشمے انہی لوگوں کے لئے ظاہر فرماتا ہے جو اپنے فرض کو پہچانتے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو رفتارِ حالات کی موجوں کے حوالہ کر کے مردہ بن جایا کرتے ہیں خدا بھی انہیں دھارے کے رخ پر بہنے ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

ایک عرصہ تک اس صورتِ حال کا علاج ہم یہ سمجھتے رہے کہ دینی اور دنیاوی علوم کا ایک ایسا جامع ادارہ قائم کیا جائے جو اس قحط الرجال کو دور کر سکے لیکن معلوم ہوا کہ موجودہ حالات میں اس قسم کا ادارہ قائم ہونا محض ایک خواب و خیال ہے۔ یہ کام معیارِ مطلوب پر یا تو حکومت کر سکتی ہے یا متحد ہو کر پوری قوم۔ یہ عظیم کام افراد و اشخاص کے بس کا نہیں ہے۔ لیکن حکومت کا حال اور مزاج یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں سے اور جو کام بھی چاہے ہو جائے لیکن دین کے اگر کسی ہوتے ہوئے کام کو بھی وہ ہاتھ لگا دے تو اس کی رہی سہی دینی روح بھی فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ رہی قوم تو وہ اس وقت ایسے انتشار اور ایسی پراگندگی میں مبتلا ہے کہ ہما شما کا تو کیا ذکر اس قوم کے بڑوں میں سے بھی اب یہ

کسی کے بس میں نہیں رہا ہے کہ وہ اس کے اندر کسی اہم سے اہم ضرورت کے لیے بھی کوئی اجتماعی احساس پیدا کر سکے۔ مذہبی قسم کی جو جماعتیں اس ملک میں کام کر رہی تھیں اور جو اس قسم کی کسی ضرورت کا احساس کر سکتی تھیں اول تو ان کے اثرات اور وسائل اتنے نہیں ہیں کہ وہ اس کام کی ہمت کر سکیں اور اگر اثرات و وسائل ہوں بھی تو ان کو سیاست کی چاٹ ایسی لگ چکی ہے کہ اب ان سے دین کے لئے کسی خیر کی امید رکھنا حماقت ہی ہے۔

ان مایوس کن حالات کے اندر مذکورہ مقصد کے لئے کوئی بہت زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز کام کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن اگر ایک کام بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکتا تو یہ بات کچھ دانشمندی کی نہیں قرار دی جا سکتی کہ اپنے بس کے اندر اس کو جس پیمانہ پر کیا جا سکتا ہے آدمی اس کا بھی تجربہ نہ کرے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم نے یہ ارادہ کیا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کچھ ذہین اور سعید طلبہ کو لے کر ان پر کچھ محنت کی جائے اور ان کو باقاعدہ دین کی تعلیم دی جائے۔ باقاعدہ سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان کو صرف بطور تبرک قرآن کے کچھ حصے ہی نہ پڑھائے جائیں بلکہ جس طرح وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید علوم و فنون باقاعدہ ایک خاص ترتیب اور مخصوص نظام کے تحت دلیل اور حجت کے ساتھ سیکھتے ہیں اسی طرح ان کو دین کے اصل ماخذوں یعنی قرآن و حدیث سے عالمانہ اور محققانہ طور پر آگاہ کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے مسائل پر دینی نقطۂ نظر سے غور کر سکیں اور اصل حقائق تک براہ راست رسائی حاصل کر سکیں۔ اور اس طرح اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر سکیں جو مختلف دینی موضوعات پر وقت کے معیار کے مطابق ریسرچ اور تحقیق و تنقید کے لئے کفایت کر سکے۔

ہم نے یہ ارادہ اپنے بعض پچھلے تجربات کی بنا پر کیا ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کر دینا ہم مناسب خیال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ حالات کی انتہائی خرابی کے باوجود آج بھی ہر بڑے شہر میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ایسے طلبا دستیاب ہو جاتے ہیں جو دین سیکھنے کے لئے اپنے اندر بڑی تڑپ رکھتے ہیں بشرطیکہ اس کے لئے ان کو کوئی ایسا انتظام میسر آ جائے جس سے وہ اپنی تعلیمی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ فائدہ اٹھا سکیں۔ دوسرا یہ کہ یہ طلبہ چونکہ فطری اور فکری طور پر ہر قسم کے سائ

سے گذرے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ عربی زبان بھی بڑی جلدی سیکھتے ہیں اور دینی علوم و مسائل کو بھی بڑی آسانی سے اخذ کرتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ لوگ دین کے فکر و فلسفہ سے آراستہ ہو کر اس زہر کا تریاق فراہم کرنے کی اپنے اندر سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں جو جدید فکر و فلسفہ نے ہماری قوم کے اندر پھیلایا ہے اور جو اب اس قوم کی رگ رگ میں اُتر چکا ہے۔

انہی اندازوں کے پیش نظر ہمارے بعض احباب نے یہ کام بعض شہروں میں شروع کیا اور اس کے لئے ہوسٹل اور تربیت گاہیں قائم کیں جن میں سے ایک آدھ کا ذکر میثاق کے صفحات میں بھی ہو چکا ہے۔ یہ کوششیں ابھی تجربہ کے ابتدائی مراحل میں ہیں اس وجہ سے ان کے نتائج کے بارے میں کوئی پیشینگوئی کرنا ابھی قبل از وقت ہے، تاہم اتنی بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مقصد کے حصول کا یہ راستہ سب سے مختصر راستہ ہے۔ اگر کوئی مشکل ہے تو یہ ہے کہ ایسے علماء کم یاب بلکہ نایاب ہیں جو جدید تقاضوں کے مطابق نئے تعلیمیافتہ لوگوں کو عربی زبان اور دین کی تعلیم دے سکیں۔ اگر اس چیز میں کامیابی ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ چند سالوں کے اندر اندر ہماری قوم میں جدید علماء کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہو جائے گی بشرطیکہ ہماری صف اول کے جو اصحابِ علم ہیں وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھیں اور اس پر اپنے وقت صرف کرنے کے لئے تیار ہوں۔

راقم سطور اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ایک عرصہ تک اس قسم کے کام کی ذمہ داری براہ راست اپنے سر لینے سے گریز کرتا رہا لیکن اس ضرورت کی اہمیت نے مجھے بھی مجبور کر دیا کہ میں بھی اس کام پر کچھ وقت صرف کروں چنانچہ علم دین کے جو قدر دان مجھ سے ملتے رہتے تھے میں نے ان پر مشتمل ایک حلقہ قائم کر دیا۔ اس حلقہ میں میری طرف سے کسی دعوت کے بغیر طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل ہو گئی جن کی اکثریت اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے ہے۔ ان میں کچھ تو ایم اے، ایم ایس سی، پی سی ایس کے ڈگری یافتہ ہیں، بعض ایم بی بی ایس کے طالب علم ہیں اور کچھ ابھی کالج کے مراحل سے گذر رہے ہیں۔ اس حلقہ کے قیام پر ابھی ایک ششماہی سے زیادہ کی مدت نہیں گذری ہے اور میں اس پر ابھی روزانہ دو گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں کرتا تاہم اس کے جو نتائج میرے سامنے ہیں ان سے میں اس نتیجہ پہ پہنچا

ہوں کہ اگر تین سال بھی یہ طلبہ میرے ساتھ وابستہ رہ سکے تو اتنے ہی وقت کے اندر جو میں ان پر صرف کرتا ہوں، ان کو کم از کم اس قابل تو کر ہی دونگا کہ وہ غور و فکر اور تحقیق و تنقید کے ان مصادر اور ان وسائل سے براہ راست استفادہ کر سکیں جن سے میں استفادہ کر سکتا ہوں۔

میں نے ان کو اس دوران میں سادہ طریقہ پر عربی زبان کی تعلیم دی ہے اور ساتھ ہی قرآن مجید اور حدیث کی کتابوں میں سے مسلم شریف کے درس دیئے ہیں۔ قرآن مجید کے درس میں ان تمام مباحث سے تعرض کیا ہے جو ابتدائی مرحلہ میں ضروری ہیں مثلاً تحقیق الفاظ، نحو، زبان، اسلوب، نظم، تاویل آیات اور استنباط احکام و مسائل۔ نظم اور حکمت کی زیادہ نازک بحثیں ابھی نہیں اٹھائی ہیں۔ زندگی ہے تو بالترتیب دوسرے اور تیسرے سال میں بقدر ضرورت ان کو بھی لونگا تاکہ یہ قرآن کے فلسفہ کلام اور اس کی حکمت سے بھی آشنا ہو جائیں۔

حدیث کی کتابوں میں سے مسلم شریف کا انتخاب میں نے اس خیال سے کیا ہے کہ تفہیم مطالب کے لئے اس کی ترتیب نہایت حکیمانہ ہے۔ اس کے درس میں وہ تمام مباحث میں نے اٹھائے ہیں جو طلبہ حدیث کے لئے ضروری ہیں مصطلحات اور اصول فن سے بھی بقدر ضرورت بحث کی ہے۔ عقائد اور فقہی مسائل میں فقہا اور متکلمین کے نقطہائے نظر اور ان کے دلائل سے بھی آشنا کیا ہے۔ اس زمانہ میں حدیث کے خلاف جو شبہات یا اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں وہ خاص طور پر میرے سامنے میں پیش نظر رہے ہیں اور ان کو بھی صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان طلبہ کے ذہن چونکہ آزاد ہیں اس وجہ سے یہ اپنے ہر قسم کے شبہات و شکوک آزادی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور میں ان کی اس آزادی کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اتنے عرصہ میں ہر قسم کے سوالات زیر بحث آئے لیکن کسی مسئلہ میں بھی وہ غیر مطمئن نہیں رہے۔ میں اپنی اس کوشش کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے خود بھی ان سے وقتاً فوقتاً سوالات کرتا رہا ہوں اور بطور تحدیث نعمت کے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کے جوابات میری توقعات سے کہیں زیادہ امید افزا ہوتے ہیں۔ میں نے

کم و بیش ۴ اسال عربی اور علوم دینیہ کے منتہی طلبہ کو قرآن، ادب اور فلسفہ تاریخ کی تعلیم دی ہے لیکن میں ا
کے نتائج سے اتنا مطمئن کبھی نہیں ہوا جتنا مطمئن اپنی اس حقیر کوشش کے نتائج سے ہوا ہوں۔

اب میری آرزو یہ ہے کہ میں اس کو ایک ادارہ کی شکل دے دوں جس کے لئے سب سے مقدم ر
یہ ہے کہ دو ایک اصحاب علم کا مجھے تعاون حاصل ہو سکے، دوسری ضرورت ایک موزوں مکان کی۔
تاکہ جو شائقین باہر سے اس حلقہ میں شرکت کے لئے آنے کے آرزومند ہیں وہ اس میں ٹھہر سکیں، تیسر
ضرورت کتابوں کی ہے تاکہ یہ طلبہ تحقیق اور ریسرچ کے کاموں میں ان سے استفادہ کر سکیں۔ اگر چ
زمانہ میں لوگ نمائش کے کاموں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور انہی پر اپنی رقمیں خرچ کرتے ہیں لیکن
اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں مدد فرمائے گا اور اس کی عنایت سے ساری ضرورت کی چیزیں فرا
ہو جائینگی۔

آخر میں، میں تمام ہوشمند اصحاب علم اور ارباب خیر کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ جن جن شہروں میں ا
قسم کے حلقے قائم ہو سکنے کا امکان ہو وہاں یہ حلقے قائم کرنے کی ضرور کوشش کی جائے۔ اس زما
میں دین کی حفاظت اور علم دین کے بقا کے نقطہ نظر سے یہ طریقہ جس قدر مفید اور نتیجہ خیز ہے کوئی دو
طریقہ نہیں ہے۔ تجربہ اس کی تصدیق کرے گا بشرطیکہ وہ اہل علم اس کو آزمائیں جو جدید تعلیم پائے ہ
لوگوں کو دین سکھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کے لئے اپنے وقت اور اپنی دوسری ہنگام
دلچسپیوں کو قربان کر سکتے ہوں، ہمارے عربی مدارس بھی اگر اس کام میں حصہ لیں تو انشاءاللہ ان کی
خدمت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو گی۔

ندبر قرآن

ین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۲۹)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

اب اس آیت اور آگے کی چار آیات میں ان خطرات و مشکلات کے مقابلہ کی تدابیر بتائی جا رہی ہیں، جو اس منصب امامت کے بعد پیش آئیں گی یا پیش آسکتی ہیں۔ یہود کو مسلمانوں کے ساتھ جو عناد تھا وہ تو اچھی طرح اوپر واضح ہی ہو چکا ہے۔ مگر قبلہ کے اشتراک کی وجہ سے یہود اب تک اس تمام اختلاف و نزاع کے اندر اتفاق کی بھی ایک جھلک دیکھتے تھے لیکن تحویل قبلہ کے بعد انہوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان اب ملت ابراہیمؑ کے وارث کی حیثیت سے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان سے بالکل ممیز ہو کر سامنے آگئے ہیں، اس چیز نے قدرتی طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے غیظ و غضب کو دو چند کر دیا۔ اسی طرح قریش جو مسلمانوں کو مکہ سے نکال کر اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ دعوت ایک اجنبی ماحول میں آپ سے آپ دب جائے گی، اب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی توقعات کے خلاف مسلمان مدینہ میں ایک طاقت بنتے جا رہے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ملت ابراہیمؑ کے اصلی وارث اور خانہ کعبہ کے جائز متولی وہی ہیں، چنانچہ انہوں نے اب اس گھر کو اپنا قبلہ بھی بنا لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب وہ اس پر قبضہ بھی کرنے کی کوشش کریں۔ اس احساس نے انہیں بھی چوکنا کیا اور وہ اس خطرہ کے سدباب کی تدبیریں سوچنے لگے جس کے نتیجہ میں تحویل قبلہ کے دو ہی مہینوں کے بعد انہوں نے اس جنگ کے اسباب پیدا کر دیئے جو تاریخ اسلام میں غزوہ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس

جنگ کے متعلق ہماری تحقیق، جیسا کہ ہم سورۂ انفال کی تفسیر میں پیش کریں گے، یہ ہے کہ یہ یہود مدینہ اور قریش مکہ کی باہمی سازش سے ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان جو اب ایک مستقل امت کی حیثیت سے ملت ابراہیمی اور قبلہ ابراہیمی کے دعویدار بن کر اٹھ رہے ہیں، ان کا زور اٹھنے سے پہلے ہی توڑ دیا جائے۔

یہ حالات اگرچہ ابھی پس پردہ تھے لیکن اس خدائے، علام الغیوب سے مخفی نہیں تھے جو کھلے اور چھپے سب سے باخبر ہے اس وجہ سے اس کی رحمت اور حکمت مقتضی ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے متنبہ بھی فرما دے اور ان خطرات کے مقابلہ میں جو چیز ان کے عزم و حوصلہ کو برقرار رکھ سکتی ہے اس کی ہدایت بھی فرما دے۔

اس سلسلہ کی پہلی بات جو آیت زیر بحث میں ارشاد ہوئی، یہ ہے کہ پیش آنے والی مشکلات میں صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ صبر اور نماز کی لغوی تحقیق، ان کے باہمی تعلق، اور اقامت دین کی جدوجہد میں ان کی عظمت و اہمیت پر تفصیلی گفتگو ہم اسی سورہ کی آیت ۴۵ کے تحت کر چکے ہیں۔ نیز فصل ۳۲ میں بھی ان کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اس وجہ سے یہاں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے البتہ بعض باتیں مخصوص اس مقام سے متعلق ہیں جن کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ مشکلات و مصائب میں جس نماز کا سہارا حاصل کرنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد صرف پانچ وقتوں کی مقررہ نمازیں ہی نہیں ہیں۔ بلکہ تہجد اور نفل نمازیں بھی ہیں۔ اس لئے کہ یہی نمازیں مومن کے اندر وہ روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں جو راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات پر فتحیاب ہوتی ہے، انہی کی مدد سے وہ مضبوط تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے جو کسی سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکست نہیں کھاتا، اور انہی سے وہ مقام قرب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی اس معیت کا ضامن ہے جس کا اس آیت میں صابرین کے لئے وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس حقیقت کی پوری وضاحت مکی سورتوں میں آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نماز تمام عبادات میں ذکر اور شکر کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نماز کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی شکرگزاری ہے۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اوپر اس امت سے یہ عہد جو لیا گیا ہے کہ فَاذْكُرُونِي

اُذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ ' اس کے قیام میں نماز سب سے بہتر وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسری یہ کہ یہ نماز دعوت دین اور اقامت حق کی راہ میں عزیمت و استقامت کے حصول کے لئے مطلوب ہے۔ اس وجہ سے اس نماز کی اصلی برکت اس صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب آدمی راہ حق میں باطل سے کشاکش کرتا ہوا اس کا اہتمام کرے۔ جو شخص سرے سے باطل کے مقابل میں لڑنے ہونے کا ارادہ ہی نہیں کرتا ظاہر ہے کہ اس کے لئے یہ ہتھیار کچھ غیر مفید ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ یہاں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کے حکم کے بعد فرمایا ہے کہ " اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے " یہ نہیں فرمایا کہ اللہ نماز پڑھنے والوں اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ استاذ امام کے نزدیک یہ ہے کہ نماز میں خدا کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح چیز ہے کہ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، واضح کرنے کی بات یہی تھی کہ جو لوگ راہ حق میں ثابت قدم رہتے ہیں اور اس ثابت قدمی کے حصول کے لئے نماز کو وسیلہ بناتے ہیں اللہ ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی معیت جس کا یہاں ثابت قدموں کے لئے وعدہ کیا گیا ہے کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بلکہ موقع کلام گواہ ہے کہ یہاں ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دُنیا پوشیدہ ہے تمام کائنات کا بادشاہ حقیقی اور تمام امر و اختیار کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو جب وہ کسی کی پشت پر ہے تو اس کو دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی کس طرح شکست دے سکتی ہے ؟

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ راہ عزیمت و استقامت میں استوار رہنے کے لئے دوسری چیز جو مطلوب ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی زندگی اور موت سے متعلق صحیح اسلامی تصور کا استحضار۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک تو زندگی نام بس اسی دُنیا کی زندگی کا ہے۔ جو آدمی مرا یا مارا گیا بس وہ ختم ہو گیا۔ لیکن مومن کے نزدیک تو یہ زندگی چند روزہ اور فانی زندگی ہے۔ اصلی زندگی کا جو ابدی ہے، آغاز تو اس کے نزدیک اس وقت سے ہوتا ہے جب یہ زندگی ختم ہوتی ہے۔ یہ زندگی عالم برزخ اور پھر عالم آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک موت کے بعد زندگی کا تعلق ہے یہ حاصل تو کافر و مومن سب ہی کو ہوتی ہے لیکن کفار کی زندگی چونکہ کلفت اور عذاب کی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ قابل ذکر نہیں۔ البتہ اہل ایمان برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے مسرور و شادکام ہوتے ہیں۔ بالخصوص

ان میں سے جو لوگ راہِ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کی برزخی زندگی کی کامرانیوں کا تو اس
اسوتی زندگی میں کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے مقدس خونِ شہادت سے اس دُنیا کی کشت
ئی کو جو سیرابی اور زندگی بخشتے ہیں اس کے انعامات ان کو عالمِ برزخ ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں،
چنانچہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا
بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ ۱۶۹۔ آلِ عمران۔

(ترجمہ) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردے نہ خیال کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے
رب کے پاس روزی پا رہے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ .... وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ | یہ اُن آزمائشوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو
آگے کے مراحل میں پیش آنے والی ہیں۔ یہ آزمائشیں اگرچہ پیش تو آئیں گی، دشمنوں کی شرارتوں اور سازشوں
کے باعث لیکن چونکہ یہ اس سنت اللہ کے تحت ہیں جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور اہلِ باطل میں
امتیاز کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔ اس وجہ سے ان کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں
گے، اور بات بصیغۂ تاکید فرمائی ہے۔ اس لئے کہ اہلِ حق کے لئے یہ امتحان و آزمائش قانونِ الٰہی
میں ناگزیر ہے۔ اس قسم کے امتحانوں سے گذر کر ہی بندوں کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور ان
کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس امتحان کے بغیر کوئی گروہ اللہ تعالیٰ کی اُخروی نعمتوں
کا سزاوار قرار نہیں پاتا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے خوف کا ذکر فرمایا ہے۔ خوف سے مراد دشمنوں کے حملہ و ہجوم کا
اندیشہ ہے۔ اوپر اشارہ گذر چکا ہے کہ ایک مستقل اُمت کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہی قریش نے
بھی مسلمانوں پر حملہ کے لئے بہانے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور یہود نے بھی ریشہ دوانیاں شروع
کر دیں، پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف سے حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ
باہر کی قوموں نے بھی اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور یہ سلسلہ اس وقت جا کر ختم ہوا جب مسلمانوں
نے اپنی عزیمت و استقامت سے اپنے تمام حریفوں کا زور اچھی طرح توڑ دیا۔

اس خوف کا ذکر "بشیءٍ" یعنی کسی قدر" کی قید کے ساتھ کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی ہمت
افزائی ہے کہ یہ حالت پیش تو آئے گی لیکن یہ اس مقدار سے زیادہ نہ ہو گی جو تمہاری عزیمت و استقامت

کی جانچ کے لئے ضروری ہے، اس وجہ سے اس سے دل شکستہ اور پست ہمت ہونے کے بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔

جوع سے مراد وہ معاشی مشکلات ہیں جو قریش اور یہود کی مشترکہ مخالفت خوف وخطرے کی حالت اور ان کی طرف سے غذائی ناکہ بندیوں کے سبب سے پیش آسکتی ہیں۔ اس وقت تک ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی وسائل وذرائع پر عملاً یہود اور قریش ہی قابض تھے، اس وجہ سے ان کے ساتھ جھگڑا مول لینا دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بَیر مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن حق کی رفاقت مقتضی تھی کہ مسلمان یہ خطرہ بھی مول لیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ خطرہ بھی مول لیا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ خطرہ ظاہر تو ہوا بعض حالات میں بہت ہی بھیانک شکل میں۔ لیکن عزم وایمان کے مقابل میں یہ بھی ٹھہر پرکاہ (دشمن) ہی کے برابر۔

اس کے بعد اموال اور انفس یعنی مال اور جان کی کمی کی آزمائش کی طرف اشارہ فرمایا اس لئے کہ جنگ وجہاد میں یہی دونوں چیزیں وسیلہ کار بنتی ہیں۔ اس وجہ سے سب سے زیادہ قربانی انہی کی دینی پڑتی ہے۔ نیز امن واطمینان کے نقدان کے سبب سے یہ اس نگہداشت سے بھی محروم ہو جاتی ہیں جو ان کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔

ثمرات کا ذکر اگرچہ اموال کے ذکر کے بعد بظاہر کچھ زاید سا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی اموال میں شامل ہے لیکن اس کے ذکر میں موقع کلام کی رعایت ملحوظ ہے۔ اہلِ عرب کی دولت یا تو اُونٹ اور بھیڑ بکریاں تھیں جن کے لئے اموال کا لفظ استعمال ہوتا تھا یا پھر پھل خصوصاً کھجور۔ ملک کی اس مخصوص حالت کی وجہ سے اموال کے ساتھ ثمرات کا ذکر بھی ہوا۔

آخر میں ان لوگوں کو خوش خبری دی گئی ہے۔ جو ان تمام آزمائشوں کے باوجود حق پر جمے رہیں۔ اور اپنے عزم وایمان میں کوئی ضعف پیدا ہونے نہ دیں۔ یہ خوش خبری قرآن کی دوسری جگہ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ	اے ایمان والو، کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت
عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ	کا پتہ دوں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے
أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَ	نجات دینے والی ہے؟ اللہ اور اس کے رسول

تُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۱۰ - ۱۳ صف

پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے کہیں بہتر ہے، اگر تم اس بات کو سمجھو، اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور ایسے مکانوں میں اتارے گا جو ابد کے باغوں میں ہیں، یہ درحاصل سب سے بڑی کامیابی ہے۔ مزید برآں ایک دوسری چیز بھی تمہیں حاصل ہوگی جسکو تم عزیز رکھتے ہو، وہ اللہ کی مدد اور عنقریب حاصل ہونے والی فتح اور اس بات کی ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ .... وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ | یہ صابرین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ آزمائشوں کا مقابلہ بددلی اور دل شکستگی کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ خندہ پیشانی اور عزم و استقلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ یہاں جو ان کا قول نقل ہوا ہے، درحقیقت ان کے اس عقیدے کا اظہار ہے جس کی چٹان پر صبر و استقامت کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس عقیدے کا ایک جزو تو یہ ہے کہ آدمی اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ اس دنیا میں اللہ ہی کا ہے اور اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کا دوسرا جزو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ جو شخص ان دو حقیقتوں پر مضبوط ایمان رکھتا ہے۔ کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کے قدم کو جادۂ حق سے ہٹا نہیں سکتی۔ جب ہم اس دنیا میں خدا ہی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں، اسی کے لئے ہمارا مرنا اور جینا ہے اور مرنے کے بعد وہی ہے جس کی طرف ہمیں جانا ہے تو پھر اس کی خاطر تو ہم ہر چیز سے منہ موڑ سکتے ہیں لیکن وہ کون سی طاقت ہو سکتی ہے جو ہمارے رُخ کو اس سے موڑ دے۔

یہی کلمہ صابرین کی ڈھال اور سپر ہے، اسی پردہ مصیبت کے ہر وار کو روکتے ہیں، اس میں اللہ کی طرف جو تفویض و سپردگی ہے وہ سرفروشی اور جاں بازی کی سپردگی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بندہ مومن جب وقت آجاتا تو یہی نعرہ لگاتا ہوا اپنے رب کے لئے دریا اور پہاڑ سے بھی لڑ جاتا ہے۔ وہ سب کے قدم اکھاڑ دیتا ہے لیکن اس کے قدم کو کوئی چیز بھی اکھاڑ نہیں سکتی۔

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ .... هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ | صلوات، صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنی لغت میں "اقبال الی الشئ" یعنی کسی چیز کی طرف بڑھنے کے ہیں۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ نماز کے لئے استعمال ہوا کہ بندہ نماز میں اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ اس التفات و توجہ کے لئے بھی آتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف فرماتا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی الطاف و عنایات الٰہی کے ہو جاتے ہیں۔ لفظ کی روح تو ایک ہی رہتی ہے لیکن نسبت کے بدل جانے سے ایک میں نیازمندی کا اور دوسرے میں لطف و عنایت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے عنایتیں کیا ہے نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے مفہوم میں اس قسم کی تبدیلیوں کی مثالیں عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔ یہاں ان صابرین کے لئے جس عنایت و رحمت اور جس ہدایت کی بشارت ہے۔ اس کا تعلق دین اور دنیا اور آخرت، جیسا کہ اوپر گذرا، دونوں ہی سے ہے۔ صبر و استقامت سے اہلِ ایمان اپنے رب کے افضال و عنایات کے مستحق قرار پاتے ہیں اور ان افضال و عنایات سے انہیں اس صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن بنتی ہے۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ .... فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝ | یہ آیت اصل سلسلۂ بحث یعنی قبلہ کی بحث سے متعلق ہے، اوپر والا مضمون، جیسا کہ واضح ہوا، ضمناً محض ایک تنبیہ کے طور پر آگیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مسلمانوں کے لئے بہت سی آزمائشوں کا پیش خیمہ ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے صبر اور نماز وسیلہ کار ہیں۔ اس ضمنی مضمون کے بعد اصل سلسلہ بحث کو پھر لے لیا اور صفا و مروہ کے شعائر اللہ میں سے ہونے اور ان سے متعلق احکام و ہدایات کا ذکر فرمایا۔ اس لئے کہ یہود نے جس طرح بیت اللہ کے قبلۂ ابراہیمی ہونے کے معاملہ کو چھپانے کی کوشش کی جس کا ذکر تفصیل سے اوپر ہو چکا ہے، اسی طرح مروہ کو بھی جو حضرت ابراہیمؑ کی اصل قربان گاہ ہے، چھپانے کی کوشش کی جس کی تفصیل آگے والی آیت کے تحت آرہی ہے۔

صفا اور مروہ بیت اللہ کے پاس کی وہ دونوں پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج و عمرہ کے موقع پر سعی کی جاتی ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" میں پوری تفصیل کیساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اصل قربان گاہ، جہاں حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کی قربانی کی، یہی مروہ ہے[1]۔

[1] یہ واضح رہے کہ اصل قربان گاہ تو یہی مروہ ہے لیکن امت کی وسعت کے پیش نظر اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔ اس مسئلہ کی تفصیلات کے لئے استاذ مرحوم کا رسالہ ذبیح ملاحظہ فرمائیے۔

جس کا ذکر تورات میں آیا ہے لیکن یہود نے بیت اللہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق کاٹ دینے کے لئے اس لفظ کو تحریف کرکے، کچھ سے کچھ کر دیا۔

شعائر، شعیرہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان (Symbol) ہو۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لئے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کئے گئے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ لیکن مقرر کئے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً قربانی حقیقت اسلام کا ایک مظہر ہے۔ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کر دے، اپنی کوئی محبوب سے محبوب چیز بھی اس سے دریغ نہ رکھے۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کرکے فرمایا وہ تاریخ انسانی کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار میں جانوروں کی قربانی کو ایک شعیرہ کے طور پر مقرر فرما دیا تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے اندر اسلام کی اصل حقیقت برابر تازہ ہوتی رہے۔

اسی طرح حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ یہ پتھر حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اس روایت کا ایک نشان ہے کہ اس کو بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بندہ اپنے رب کے ساتھ اپنے عہد بندگی اور اپنے میثاق اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں اس کو یمین اللہ (خدا کا ہاتھ) سے تعبیر کیا گیا جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ جب اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا وہ خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے تجدید بیعت کرتا ہے۔ اور جب اس کو بوسہ دیتا ہے تو گویا یہ اس کی طرف سے خدا کے ساتھ عہد محبت و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح جمرات بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ یہ نشانات اس لئے قائم کئے گئے ہیں کہ حجاج ان پر کنکریاں مار کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے دشمنوں اور اسلام کے دشمن پر خواہ وہ ابلیس کی ذریات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا انسانوں کے کسی گروہ سے، لعنت کرتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کے لئے ہر وقت مستعد ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس بیت اللہ بھی ایک شعیرہ بلکہ سب سے بڑا شعیرہ ہے جو پوری امت کا قبلہ اور توحید و نماز کا مرکز ہے۔ اس کے ارد گرد طواف کر کے اور اپنی نمازوں اور اپنی تمام مسجدوں کا اس کو قبلہ قرار دے کر ہم اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جس خدائے واحد کی عبادت کے لئے یہ گھر تعمیر ہوا ہم اسی کے بندے، اسی کی طرف رُخ کرنے والے، اسی کے عبادت گذار اور اسی کی شمع توحید پہ پروانہ وار نثار ہیں۔

اسی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔ ان کے شعائر میں سے ہونے کی وجہ عام طور پر تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ انہی دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے پانی کی تلاش میں تگ و دو کی تھی لیکن استاذ امام کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے۔ یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں فرمانبردارانہ اور غلامانہ سرگرمی دکھائی اس وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں کو شعائر میں سے قرار دے دیا گیا اور ان کی سعی کی یادگار ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی گئی۔

ان شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ یہ شعائر اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ ہیں۔ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی چیز کو دین کے شعائر میں سے قرار دے دے یا جو چیز شعائر میں داخل ہے اس کو شعائر کی فہرست سے خارج کر دے۔ دین میں اس قسم کے من مانے تصرفات سے شرک و بدعت کی راہیں کھلتی ہیں۔ جن قوموں نے اپنے جی سے شعائر قرار دیئے تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اس طرح شرک و بُت پرستی کی راہیں کھول دیں۔

دوسری یہ کہ جس طرح شعائر اللہ کے مقرر کردہ ہیں اسی طرح اسلام میں ان شعائر کی تعظیم کے حدود بھی خدا اور رسول ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ جس شعیرہ کی تعظیم کی جو شکل شریعت میں ٹھہرا دی گئی ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کی واحد شکل ہے جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے، اس سے سرمو انحراف نہ صرف اس شعیرہ کی حقیقت سے انسان کو محروم کر دینے والی بات ہے بلکہ اس سے شرک و بدعت کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ اس کی تعظیم کے لئے اس کو حالتِ طواف میں بوسہ دینے یا اس کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لینے یا اس کی طرف اشارہ

کرنے کی شکلیں محمدؐ دین کے لانے والے کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص تعظیم کی صرف انہی شکلوں پر قناعت نہ کرے بلکہ تعظیم شعائر اللہ کے جوش میں وہ اس پتھر کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگے یا اس کے سامنے نذر نیاز پیش کرنے لگے یا اس پر پھول نثار کرنے لگے یا اس طرح کی کوئی اور حرکت کرنے لگے تو ان باتوں سے وہ نہ صرف یہ کہ اس حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گا جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے بلکہ وہ شرک و بدعت میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

تیسری یہ کہ ان شعائر میں اصل مطمح نظر وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہیں۔ ان حقیقتوں کے اظہار کے لئے یہ شعائر گویا قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ملت کی زندگی کے لئے سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں یہ حقیقتیں برابر زندہ اور تازہ رکھی جائیں۔ اگر یہ اہتمام سرد پڑ جائے تو دین کی اصل روح نکل جاتی ہے۔ صرف قالب باقی رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی اصل توجہ صرف قوالب پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین صرف ایک مجموعہ رسوم بن کے رہ جاتا ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ جو فرمایا کہ "صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں"، تو اس سے مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ ان دونوں شعائر کو جاہلیت کے گرد و غبار سے پاک کر کے ان کو وراثت ابراہیمی کی حامل امت کے لئے از سر نو اجاگر کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرب جاہلیت نے ان دونوں پہاڑیوں پر، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، دو بُت رکھ دیئے تھے۔ اور ان بتوں کے لئے سعی و طواف کرنے لگے تھے جس کے سبب سے ان شعائر کا نہ صرف شعائر ابراہیمی میں سے ہونا مشتبہ ہو گیا تھا بلکہ یہ علانیہ شرک و بت پرستی کے مظہر بھی بن گئے تھے۔ قرآن نے اوپر کی آیات میں جس طرح بیت اللہ کو تمام مشرکانہ آلودگیوں سے پاک صاف کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں پیش کیا اسی طرح یہاں صفا اور مروہ کی اصل تاریخ بیان فرمائی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شعائر اللہ میں سے ہیں اور ان کے سعی و طواف کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی سعی و طواف کی یادگار ہے لیکن مشرکین نے جس طرح توحید کے مرکز بیت اللہ میں سیکڑوں بت لاکر رکھ دیئے اسی طرح ان شعائر کو بھی بُت پرستی سے ملوث کیا، اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم گندگی کے اس ڈھیر کو ہٹا کر ان شعائر کو از سر نو اجاگر کرو اور ان کے سعی و طواف کو صرف اللہ ہی کے لئے خاص کرو۔

دوسری طرف یہود نے ان شعائر پر تحریف اور کتمان کا جو پردہ ڈال دیا تھا، جیسا کہ آگے والی آیت میں ذکر آرہا ہے، قرآن نے وہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ تورات میں یہ ذکر صراحت کے ساتھ موجود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی مروہ کے پاس کی لیکن یہود نے محض اس خیال سے اس لفظ کا صحیح تلفظ بالکل مسخ کر ڈالا کہ کسی طرح اس مقام کو مکہ کے بجائے بیت المقدس میں ثابت کر سکیں۔ اور اس طرح آخری نبی کی بعثت سے متعلق جو پیشینگوئیاں تورات میں موجود ہیں وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل کی جگہ حضرت اسحٰقؑ کی نسل کی طرف منتقل ہو سکیں۔ قرآن نے یہاں مروہ کا حوالہ دے کر اس نشان کی طرف انگلی اٹھا دی جس کو محض حسد اور شرارت کی بنا پر غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ان دونوں پہاڑیوں کے طواف کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی صحیح شکل اور اس کے حدود کا تعین دوسرے مناسک حج کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں لفظ طواف کا استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد وہ سعی ہی ہے جو ان دونوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اس سعی کو طواف کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل اس طواف سے ملتی جلتی ہوتی ہے جو خانہ کعبہ کے اِردگِرد ہوتا ہے۔ اس سعی کو حج و عمرہ کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ حج و عمرہ کے مجموعہ ہی کا ایک جزو ہے، ان سے علیحدہ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اس سے ان مشرکانہ رسوم کی بالکل نفی ہو جاتی ہے جن کا اضافہ ان شعائر کے سلسلہ میں مشرکین نے کر دیا تھا۔

اس طواف کا حکم جن الفاظ میں وارد ہے وہ کسی قدر وضاحت طلب ہیں۔ فرمایا ہے

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ 　　پس جو حج یا عمرہ کرے تو اس کیلئے اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے۔

اس اسلوب بیان سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ اس سعی کے لئے شریعت میں صرف اجازت ہے، اگر کوئی شخص یہ نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مراد یہ ہوتی تو اسلوب کلام، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، فلا جناح علیہ ان یطوف بھما کے بجائے ان لا یطوف بھما ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ

فرمانے کے بعد کہ صفا اور مروہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں یہ کہنا کچھ ناموزوں اور بے جوڑ سا ہو جاتا ہے کہ ان کا طواف کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ پہلی بات کے بعد اس کے ہموزن اور اس سے ہم آہنگ بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا طواف ضروری قرار دیا جائے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس درجہ میں ضروری ہے، اس کی حیثیت فرض کی ہے یا واجب کی یا مستحب کی، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنے کی تو کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ اس قدر شاندار تمہید کے بعد اصل بات اتنے کمزور درجہ کی ہو۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال یہی ہے کہ یہاں سعی کا حکم ہے اور یہ حکم وجوب کے درجہ میں ہے۔

لیکن اس پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدعا یہی ہے تو یہاں فَلَا جُنَاحَ کا مطلب کیا ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس رفع حرج کا تعلق سعی کے حکم سے نہیں ہے بلکہ اس قباحت سے ہے جو اس حکم کے نزول کے وقت مقام سعی میں بتوں کی موجودگی کی وجہ سے پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت صفا اور مروہ میں یہ قباحت موجود ہے لیکن چونکہ یہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے شعائر حج میں سے ہیں اس وجہ سے حج و عمرہ کے موقع پر ان کے درمیان سعی کرو، تمہارا عمل تمہاری نیت کے مطابق ہوگا۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝ میں تطوع سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی فرض سے سبکدوش ہو چکنے کے بعد خدا کی خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مزید اس کو ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے انجام دے۔ یہاں اس تطوع کا تعلق صرف سعی کے حکم سے نہیں ہے اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ کہ سعی کوئی مستقل عبادت نہیں ہے بلکہ یہ حج و عمرہ ہی کا ایک ضمیمہ ہے، اس وجہ سے اس تطوع کا تعلق بھی حج و عمرہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو حج و عمرہ وہ ہے جو ادائے فرض کے طور پر انجام دیا جائے، دوسرے تطوع کے طور پر بھی حج و عمرہ کئے جا سکتے ہیں، جو لوگ ایسا کریں گے اللہ ان کی اس نیکی کو قبول فرمائے گا اور یہ اس کے علم میں رہے گی۔ ایک دن وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

شکر کا لفظ صلوٰۃ یا توبہ کے الفاظ کی طرح ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی میں نسبت کی تبدیلی سے فرق ہو جایا کرتا ہے۔ جب بندے کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کے معنی شکر گزاری کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہیں

جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ ...... يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ | یہ اشارہ یہود کی طرف ہے اور آیت میں بینات اور ہدیٰ سے مراد اگرچہ وہ عام تعلیمات بھی ہیں جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر نشانیاں مراد ہیں جو تورات میں اللہ تعالیٰ نے اس لئے واضح فرمائی تھیں کہ ان کی مدد سے یہود کو آخری پیغمبر کے باب میں رہنمائی حاصل ہو سکے لیکن یہود نے ان نشانیوں سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے ان کو چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی بعض مثالیں ہم اس کتاب کے پچھلے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم استاذ امام کی عظیم تصنیف الرای الصحیح فی من ہو الذبیح کی آٹھویں فصل کا حوالہ دینگے جس میں انہوں نے مروہ سے متعلق یہود کی تحریفات پر بحث کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی جگہ کو تورات سے غائب کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کیں اور کس بیدردی کے ساتھ لفظ مروہ کا حلیہ بگاڑا تاکہ آخری نبی کی پیشینگوئیوں سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں گھپلا پیدا کیا جا سکے۔

ایک عظیم حقیقت کا چھپانا جب کہ وہ ان کی اپنی کتاب میں اچھی طرح واضح کی جا چکی ہو اور جس کو خلق کے سامنے واضح کرنے کا ان سے عہد بھی لیا جا چکا ہو، جیسا کہ آل عمران ۱۸۷ میں حوالہ ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ۔	اور یاد کرو جب کہ اللہ نے اہل کتاب سے میثاق لیا کہ اس کتاب کو اچھی طرح لوگوں کے سامنے واضح کرنا۔

یہود کا ایک ایسا جرم تھا جس پر وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہرے اور کتاب الٰہی کی امانت جو ان کے سپرد کی گئی تھی ان سے چھین کر دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔

اس لعنت کے متعلق فرمایا ہے کہ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ○ اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح اصطفا یعنی کسی اُمت کا دنیا کی امامت کے لئے منتخب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے اسی طرح یہ لعنت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے

بڑی سزا ہے۔ جس قوم کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ دنیا میں توفیق ہدایت اور منصب امامت سے محروم کرکے ذلت وخواری میں مبتلا کر دی جاتی ہے اور آخرت میں اس کے لئے ابدی عذاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی حق پوشی سے صرف اپنی ہی ضلالت کا سامان نہیں کرتی بلکہ راہ کے نشانات ہدایت غایب کرکے دوسرے بے شمار لوگوں کو بھی گمراہی اور ہلاکت میں مبتلا کرتی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا .... التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حق پوشی کے جرم سے توبہ کر لیں۔ اس توبہ کے ساتھ اصلحو" کی شرط لگائی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کرے جس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مزید شرط اس کے ساتھ بینوا کی لگائی۔ یہ موقع کی مناسبت سے ہے اور سابق الذکر اصلحوا کی وضاحت کر رہی ہے یعنی آخری نبی سے متعلق تورات کے جن حقائق و بینات کو انھوں نے چھپایا ہے اس کو ظاہر کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کم از کم یہود کے خواص اور علماء ان تحریفات سے بے خبر نہیں تھے جو حق پوشی کی سازش کے تحت کی گئی تھیں یا کی جا رہی تھیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے بھی بہم پہنچ رہا ہے کہ یہود کے اہل علم میں سے جو لوگ نعمت اسلام سے بہرہ یاب ہوئے انہوں نے اس قسم کے بہت سے حقائق سے پردے بھی اُٹھائے۔

"اتوب علیہم" میں توبہ کے ساتھ علی کا صلہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے اندر رحمت کا مضمون بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کرتا اور ان پر رحم کرتا ہوں۔ لفظ کی اس مخفی حقیقت کو "انا التواب الرحیم" کہہ کر واضح فرما دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ ...... وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ "جن لوگوں نے کفر کیا اور حالت کفر ہی میں مرے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی ضد پر اڑے رہ گئے اور توبہ واصلاح اور اظہار واعلان حق سے محروم ہی دنیا سے اُٹھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی ایک ایسا جرم ہے جو ان کی دینداری کی وہ دوسری باتوں اور ان کے ایمان ومحبت الٰہی کے تمام دعووں کو بالکل باطل کر دے گا۔ اور اس کی پاداش میں وہ اللہ اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کے سزاوار ہوں گے۔ یہاں اللہ کی لعنت کے ساتھ فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا ذکر اس اجمال کو واضح کر رہا ہے جو اُوپر والی

آیت کے الفاظ علیہم اللاعنون میں موجود تھا اور الناس کے ساتھ اجمعین کی قید یہ حقیقت واضح کر رہی ہے کہ قیامت کے روز جب اصل حقیقت سے پردہ اٹھیگا تو صرف نیک لوگ ہی ان پر لعنت نہیں بھیجیں گے بلکہ وہ گنہگار بھی ان پر لعنت بھیجیں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوں گے۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ | یعنی نہ تو جس عذاب میں وہ ڈالے جائیں گے اس میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اس کے تسلسل میں کوئی وقفہ یا انقطاع واقع ہوگا کہ اس سے انہیں ذرا دم لینے کا موقع مل جائے۔

۵۵۔ آگے کا سلسلۂ کلام (آیات ۱۶۳-۱۷۶)

آیت ۱۶۲ پر اس سورہ کا پہلا باب ختم ہوا۔ اس باب میں یہود منصب امامت سے معزول ہوئے اور ایک نئی امت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ اب آگے آیت ۱۶۳ سے اس سورہ کے مطالب کا دوسرا باب شروع ہو رہا ہے جس میں اس نئی امت کے لئے از سر نو شریعت الٰہی کی تجدید کی جارہی ہے۔ اس باب میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ امت کو وہ احکام دیئے گئے ہیں جن کے لئے سورہ کے زمانہ نزول کے حالات متقاضی تھے اور ساتھ ہی ہر حکم کے تحت ان بدعات کی تردید کی گئی ہے جو یہود یا مشرکین نے شریعت الٰہی میں ملا دی تھیں۔

اس باب کا آغاز توحید کے بیان سے ہو رہا ہے اس لئے کہ تمام دین کی بنیاد اسی چیز پر ہے۔ توحید کے دعوے کے ذکر کے بعد اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ توحید کی یہ دلیل وہی دلیل ہے جس کی طرف اس کتاب کی فصل ۲۳ میں ہم دلیل توافق کے نام سے اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ دلیل اپنے بعض نئے پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے جن کی وضاحت آیات کی تفسیر کے تحت آئے گی۔ پھر شرک کی تردید فرمائی ہے۔ اس ضمن میں کسی چیز کو خدا کے حکم کے بغیر حرام یا حلال ٹھہرانے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ اس لئے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چیز بھی شرک ہی میں داخل ہے۔

پھر ان چیزوں کی طرف ایک سرسری اشارہ فرمایا جو فی الواقع اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مشرکین یا اہل کتاب نے بعض چیزیں جو اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے

تحت یا اپنی خواہشوں کے لئے حرام یا حلال کی ہیں ان کی تحریم و تحلیل کو شریعت الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں مشرکین کو ان کی اندھی بہری تقلید آباء پر اور اہل کتاب کو ان کی حق پوشی پر سرزنش فرمائی ہے کہ اگر یہ عقل سے کام لیتے اور محض خواہشات نفس کی پیروی میں ضلالت کو ہدایت پر ترجیح نہ دیتے تو وہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت نہ کرتے لیکن انہوں نے اپنی شامت اعمال سے اپنے لئے ابدی ہلاکت کی یہی راہ اختیار کی ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۖ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذٰلِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝ إِنَّمَا

حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ إِنَّ
الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُونَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ
أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا
يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتٰبِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ ع

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لئے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اُتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے۔ اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس وقت کا خیال کرو جبکہ مقتدا اپنے پیروؤں سے اظہار براءت کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یکقلم ٹوٹ جائیں گے اور ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ اے کاش ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ

ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار براءت کر سکتے جس طرح انہوں نے ہم سے اظہار برات کیا ہے! اس طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایہ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

اے لوگو، زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمہیں برائی اور بےحیائی کی راہ سوجھائے گا اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اُتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جبکہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں؟ ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے۔

اے ایمان والو، جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ، اور اللہ ہی کے شکر گذار بنو اگر تم اس کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس نے تو بس تمہارے لئے مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے اور وہ خواہشمند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لئے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں سے اُتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ ان کو پاک کریگا۔ ان کے لئے بس عذاب دردناک ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی۔ یہ دوزخ کے معاملہ میں کتنے ڈھیٹ ہیں! ۔

یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ نے اپنی کتاب حق کے ساتھ اُتاری ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے۔

افادات فراہیؒ
جناب خالد مسعود صاحب

اصولِ تفسیر

(۵)

تعیینِ خطاب تفسیرِ قرآن کی چوتھی بنیاد خطاب کا تعین ہے۔ اسی سے خطاب کا صحیح رخ اور اس کا لہجہ متعین ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلام کا مضمون تسلی و رافت کا ہے یا زجر و غضب کا، اس کا مقصد وعدہ وعید ہے یا استدلال و دعوت۔

خطاب کی بحث میں غور کرنے کے پہلو دو ہیں۔ ایک یہ کہ خطاب کس کی طرف سے ہے اور دوسرا یہ کہ خطاب کس سے ہے۔

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالے کا کلام ہے یعنی اس کو اللہ تعالےٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ہے مثلاً

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (فاتحہ ۴) — ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

اس میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علماء اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو۔ سورۃ فاتحہ کے علاوہ بھی قرآن میں ایسی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعاؤں کی تعلیم دی ہے۔ مزید برآں اس میں مخلوقات مثلاً کافر و مومن اور جن و انس و ملائکہ کے اقوال کا بیان بھی ہے۔ اگر متکلم کی تصریح ہوگئی ہو تب تو یہ سوال پیدا نہیں

ہوتا کہ خطاب کس کی طرف سے ہے۔ لیکن جہاں تصریح نہ ہو وہاں موقع کلام اور حسن تاویل سے متکلم کا فیصلہ کرنا کافی غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں پر ایک بے خبر آدمی خدا سے وہ باتیں منسوب کرسکتا ہے جو اس کی جلالت شان کے منافی ہیں۔

اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارہ میں بھی پیدا ہوتا ہے یعنی خطاب کن سے ہے۔ چونکہ مخاطب کی تبدیلی سے معانی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوجاتی ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے لئے ایسے اصول دریافت کئے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کرسکیں کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں جو آدمی کو شائبہ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ مولانا رومؒ ایک جگہ یہ تک کہہ گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی کا بندہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا ... الآیۃ (اے میرے بندو جنہوں نے زیادتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں۔ مولانا رومؒ کے متعلق میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انہوں نے فی الحقیقت نبیؐ کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے لیکن بات ان کی زبان سے ایسی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے۔ اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ یَا عِبَادِیَ کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔ اس کے شروع میں جو قُلْ ہے وہ پیغمبرؐ کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچائیں۔

کسی عام کلام کی توجیہ اس کی خاص جہت خطاب کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے۔ تعیین خطاب کا علم اسی باب کا ایک شعبہ ہے جس شخص پر کلام کا صحیح رُخ واضح نہیں ہوگا وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہوسکتی ہے۔ چونکہ مسئلہ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس کے اصول متعین کرنے کی کوشش کریں۔

تعیین خطاب کے اصول

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اس کو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیئے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اختیار کرنا اور بعض کو چھوڑنا ناگریز ہوگا۔ جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو اختیار کرتے ہیں اور کسی کو چھوڑتے ہیں، وہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہوگا جب کوئی

خطاب مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو۔ لہٰذا اولین شے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے مختلف پہلو معلوم کریں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہیٰ ۔

مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا جبریل یا رسول یا لوگ ۔ اسی طرح منتہیٰ یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا رسول یا لوگ لوگوں میں مسلمان ہوں گے یا منافقین یا اہل کتاب یا ذریت اسمٰعیل یا ان میں سے دو یا تین یا سب۔

اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں ۔

یہ پہلو تو بالکل ظاہر ہیں ۔ اب ان کے اختلاط و التباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیئے ۔

مصدر میں التباس

مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ ، رسولؐ اور جبرئیل کے مابین ہوتا ہے ۔ اگر تم بغیر تنبیہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ قائل کون ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں ۔ یہ کبھی تو بعینہٖ مرسل کا قول نقل کر دیتے ہیں۔ اور کبھی وہ بات بطور خود ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے ۔ پھر حضرت جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلغ کلام الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپؐ کے معلم کی حیثیت سے، اور ان کے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ — اس کو سکھایا نہایت قوت والے طاقتور نے ،

فَاسْتَوٰى (نجم ۵، ۶) — پس وہ سیدھا کھڑا ہوا۔

پھر یہ تمام صورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی امتیاز کے نمایاں ہوتی ہیں، اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی ۔

اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انبیاء کے کلام کی یہ ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ زبور میں بھی اس کی مثال موجود ہے ۔ دیکھو ب ۴۶ آیات ۷ — ۱۱

" لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے ۔ یعقوب کا خدا ہماری پناہ ہے ۔ آؤ خداوند کے کاموں کو دیکھو ..... خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں ۔ میں قوموں کے درمیان سربلند ہونگا — لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے "

قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے ۔ کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا ۔ تو اس میں جلال و

ہیبت اور قوت وسطوت کا اظہار ہوگا۔ لہٰذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ علق شروع سے حضرت جبریلؑ کی زبان سے ہے۔ لیکن جب غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہوگیا ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (علق ۱۵) کچھ نہیں۔ اگر باز نہ آیا تو ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

مخاطب میں التباس

قرآنِ پاک میں کہیں کہیں تو مخاطب کی صراحت کردی گئی ہے مثلاً وہ آیات جو يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، يَاَيُّهَا النَّاسُ وغیرہ الفاظ سے شروع ہوتی ہیں یا جو جمع کے صیغہ سے آتی ہیں، اپنے مخاطب کے معاملہ میں صاف ہیں۔ لیکن کہیں کہیں مخاطب کے تعین میں بھی التباس ہوجاتا ہے۔ اس کی دو نمایاں شکلیں ہیں جن کی ہم تفصیل کرتے ہیں۔

پہلی شکل :۔ جہاں کہیں خطاب واحد سے ہوتا ہے، واضح قرینہ نہ ہونے کی وجہ سے عام مفسرین وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لے لیتے ہیں۔ حالانکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ خطاب بظاہر تو پیغمبر سے ہے لیکن فی الحقیقت روئے سخن اُمت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر چونکہ اُمت کا وکیل اور امام ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے۔ اس لئے مخاطب اسی کو کیا جاتا ہے۔ توریت میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ مخاطب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصیغہ واحد کہا گیا ہے لیکن اس سے مراد ان کی اُمت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع پر نظم وسیاق کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے؟ چند مثالوں پر غور کرو۔

۱۔ سورۃ انعام کی آیت ۶۶ میں فرمایا۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

اور اس کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سراسر حق ہے۔ کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں۔ ہر خبر کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہوجائے گا۔

یہاں مخاطب واحد کے صیغہ سے ہے جس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی دوسری آیت میں واحد کے صیغہ سے ہی خطاب کیا مگر اس سے مراد اُمت لی۔ فرمایا

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○ (انعام ۶۸)

اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں باتیں بنا رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں اور اگر یہ بات شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔

یعنی تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات کے ذریعہ نصیحت کرو لیکن جب وہ باتیں بنانے لگیں تو ان سے اعراض کرو۔ گویا یہاں دو چیزوں کا حکم دیا۔ ایک نصیحت دوسرے اعراض۔ پھر اس کو کھول بھی دیا۔ فرمایا۔

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرَى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○ (انعام ۶۹)

اور پرہیزگاروں پر ان لوگوں کے حساب کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں، البتہ نصیحت کی ذمہ داری ہے تاکہ وہ بھی پرہیزگار ہوں۔

یعنی ظالمین کے حساب کی ذمہ داری مؤمنین پر نہ ہوگی۔ البتہ وہ نصیحت کے جوابدہ ہوں گے نصیحت کے بعد اگر کوئی قوم کفر کی روش پر چلے گی تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے اس کا محاسبہ نہیں کرے گا۔ وہ ان کی بدعملیوں سے بری الذمہ قرار دیئے جائیں گے۔

سورۂ نساء کی آیت ۱۴۰ اسی مضمون کو پیش کرتی ہے۔ وہاں فرمایا!

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ ○

اور خدا نے تم پر اپنی کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم سنو کہ خدا کی آیتوں کا انکار ہو رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو جب تک وہ لوگ اور باتیں نہ کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ آیت سورۂ انعام کی اسی آیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اس کے سوا اور کوئی آیت اس مضمون کی نہیں آتی۔ اسی سبب سے بعض مفسرین مثلاً ابن جریر کو یہ گمان بھی ہوا کہ اس آیت نے سورۂ انعام والی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ حالانکہ یہاں نسخ کے ماننے

کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس آیت میں کفار کی مجلسوں میں اس وقت بیٹھے رہنے سے منع کیا ہے جب کہ وہ اسلام کا استہزا کر رہے ہوں۔ یہی مضمون سورۂ انعام والی آیت میں بھی ہے۔

۲- اس خطاب کی دوسری مثال سورۂ ہود میں ہے فرمایا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ۝ (ھود ۱۱۲ تا ۱۱۴)

پس قائم رہو تم اور جو لوگ تمہارے ساتھ تائب ہوئے ہیں، جیسا تم کو حکم دیا جاتا ہے۔ اور حد سے تجاوز نہ کرنا۔ بیشک وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اور جو لوگ ظالم ہیں ان کی طرف مائل نہ ہونا ورنہ تمہیں دوزخ کی آگ آ لپٹے گی۔ اور خدا کے سوا تمہارے کوئی دوست نہ ہوں گے پھر تمہیں کہیں سے مدد نہ مل سکے گی۔ اور دن کے دونوں سروں اور رات کی چند ساعات میں نماز پڑھا کرو۔ بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں نصیحت قبول کرنیوالوں کے لئے یہ نصیحت ہے۔

یہاں لَا تَطْغَوْا سے آگے خطاب دراصل نبیؐ کے واسطہ سے عام لوگوں سے اور اُمت سے ہے۔

۳- سورۂ توبہ کی ایک آیت ہے۔

إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ (توبہ۔ ۵۰)

اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں، خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا۔

یہاں خطاب واحد کا ہے لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (توبہ۔ ۵۱)

کہہ دو نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی مصیبت مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے وہ ہمارا مولا ہے اور چاہیئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان۔

دوسری شکل :- خطاب کی دوسری شکل یہ ہے کہ خطاب تو واحد ہی سے ہوتا ہے مگر دراصل اس کا رُخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر ہی لوگوں سے ہوتا ہے۔ یہ خطاب کبھی کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب سے قبل یا اس کے بعد التفات کے طریقہ سے بھی آتا ہے۔ جو لوگ زیادہ غور و فکر نہ کریں اور حسنِ تاویل کی کوشش نہ کریں، وُہ ایسے مواقع پر بات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور ضمائر کے انتشار سے بچنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ موقع التفات کا ہوتا ہے۔ یہاں ضمیر کے مرجع کی تبدیلی پائی جائے تو کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔

اس طرح کے خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بے شمار ہیں، ہم چند ایک مثالیں یہاں پیش کریں گے۔ فرمایا۔

۱- وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ؁	اور تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ احسان کرو اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کو اُف کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب کی بات کہنا۔

(بنی اسرائیل ۲۳)

اس آیت ------ میں واحد سے جمع اور جمع سے واحد کی طرف منتقل ہونے کی ایک سے زیادہ مثالیں موجود ہیں لیکن مراد یہاں عموم ہی ہے۔ یہاں پر ایسے قرینے بھی موجود ہیں کہ کسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک معمولی علم کا آدمی بھی جانتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین زندہ نہ تھے کہ آپ کو اس آیت کے ذریعہ ان کے ساتھ احسان کا حکم دیا جاتا۔

۲- اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (فیل - ۱)	کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟

یہاں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے لیکن مراد عام ہے۔ اس بات کا صاف قرینہ موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے وہی لوگ اس کے مخاطب ہوں جنہوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ خطاب کے عموم پر دلالت کرنے کے لئے کوئی دلیلِ قاطع آیت میں موجود ہو۔ یہ حقیقت اسلوبِ کلام اور حسنِ تاویل کی معرفت سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیات دیکھئے۔ فرمایا

۱- فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللهُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۝ (نساء ۸۸)

تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو حالانکہ خدا نے ان کو انکے کرتوتوں کے سبب اوندھا کر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے اس کو رستے پر لاؤ اور جس شخص کو خدا گمراہ کر دے تم اس کیلئے کبھی بھی رستہ نہیں پاؤ گے۔

یہاں ابتدا میں کلام جمع کے صیغہ سے شروع ہوا لیکن لَنْ تَجِدَ لَهُ میں واحد کی ضمیر آگئی جس سے مراد عام خطاب ہی ہے۔

۲- أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَةِ اللهِ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ (لقمان - ۳۱)

نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل سے تاکہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔

اس آیت میں کلام واحد کے صیغہ (اَلَمْ تَرَ) سے شروع ہوا لیکن پھر لیریکم میں جمع کی ضمیر آگئی ہے کیونکہ واحد سے مقصود درحقیقت جمع ہی ہے۔

۳- أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (ابراہیم ۱۹)

نہیں دیکھتے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق بسائے۔

اس آیت میں بھی وہی اصول ملحوظ ہے۔

۴- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ

اے ایمان والو راعنا مت کہو بلکہ انظرنا کہو اور غور سے سنو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا اسے نظر انداز کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی جیسی آیت اس کی جگہ لاتے ہیں۔ کیا تم -

تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ (بقرہ ۱۰۶-۱۰۷)

نہیں جانتے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی ہے اور نہ کوئی مددگار۔

دیکھو خطاب جمع کے صیغہ لَا تَقُوْلُوْا سے شروع ہوا، پھر واحد اَلَمْ تَعْلَمْ کا صیغہ آگیا اور اس کے بعد وَمَا لَكُمْ میں پھر جمع کی ضمیر آگئی کیونکہ اَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب دراصل عام ہی تھا۔

۵۔ سورہ حاقہ کی آیت ۷

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى — تو تو لوگوں کو اس میں پچھاڑے ہوئے پڑے دیکھتا۔

میں خطاب عام ہے، گویا مطلب یوں ہے کہ اے مخاطب اگر تو وہاں ہوتا تو یہ دیکھتا۔

۶۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ○ (التین ۸) — سو اب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے، کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟

میں بھی خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ مخاطب سب ہے۔ اہل تاویل نے اس آیت میں خطاب کی تعیین میں سخت غلطی کی ہے۔

۷۔ آیات

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ○ — تو اپنے رب کے کون کون سے کرشموں میں شک کرے گا؟

اور

مَا اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ — اور تونے اس ٹھوکنے والی کو کیا سمجھا؟

وغیرہ میں بھی عام خطاب ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

الغرض جب قرآن نے عام انسانوں یا مخاطب جماعت کو حسب موقع واحد، جمع، تثنیٰ کے صیغوں سے اکثر مخاطب کیا ہے تو تعیین خطاب میں اصول کی حیثیت سے حسن تاویل ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(باقی)

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

غلافِ کعبہ سے متعلق!

ادھر کچھ عرصہ سے ہمیں برابر ملک کے مختلف گوشوں سے غلافِ کعبہ سے متعلق استفسارات موصول ہو رہے ہیں جن میں تھوڑے تھوڑے تغیرِ الفاظ کے ساتھ تقریباً ایک ہی طرح کے سوالات ہم سے کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ غلافِ کعبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کی تعظیم و احترام کے حدود کیا ہیں؟ اس کی زیارت اور اس کے جلوس وغیرہ کے لئے حال میں بعض جماعتوں کی طرف سے جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے، اس کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں کیا رائے ہے؟ یہ سنت ہے یا بدعت؟ اگر بدعت ہے تو کیا دین میں اس کے گوارا کئے جانے کے لئے کوئی گنجائش ہے یا یہ محض ایک بدعت ضلالت ہے؟ عوام کی طرف سے غلاف کے لئے جس نوعیت کا اظہار عقیدت کیا گیا ہے، جس کی تفصیلات اخبارات میں چھپی ہیں، کیا غلاف کعبہ کے لئے اس طرح اظہار عقیدت جائز ہے یا یہ باتیں شرک و بدعت کے حکم میں داخل ہیں؟ اگر یہ باتیں شرک و بدعت کے حکم میں داخل ہیں تو ان کی ذمہ داری کن لوگوں پر ہے، عوام پر یا غلافِ کعبہ کے جلوس اور اس کی زیارت کے لئے اہتمام کرنے والوں پر؟

اس طرح کے سوالات پر مشتمل درجنوں خطوط ہمیں موصول ہو چکے ہیں، جن میں سے بعض کے مختصر جوابات تو ہم نے لکھ دیئے ہیں۔ لیکن ان سارے خطوط کے جواب دینا ہمارے لئے نہایت مشکل بلکہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے اس وجہ سے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ ان صفحات میں چند اصولی باتیں غلافِ کعبہ کی شرعی حیثیت اور تعظیم و احترام کے اُن ہنگاموں سے متعلق عرض کر دیں جو پچھلے دنوں ظہور میں آئے ہیں۔ امید ہے کہ مستفسرین ان کے اندر اپنے سوالوں

کے جواب ڈھونڈھ لیں گے ۔

۱۔ غلافِ کعبہ سے متعلق سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنے کی ہے کہ یہ شعائر اللہ میں داخل نہیں ہے۔
ں کسی کو بھی یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ شعائر اللہ میں سے کوئی شعیرہ ہے اس کو یہ مغالطہ اگر دیدہ و دانستہ
یں لاحق ہوا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ محض دین اور شعائر دین سے بے خبری کا نتیجہ ہے ۔ اسلام میں
ی چیز کو شعیرہ قرار دینے کا حق زید، عمر، بکر کو نہیں ہے بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسول کو ہے ۔ اللہ اور اس
، رسول نے جن چیزوں کو شعائر کی حیثیت دی ہے اُن کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی ۔ مجھے
یں ان کی فہرست میں غلاف کعبہ کا ذکر نہیں ملا۔ صحابہؓ اور بعد کے علماء میں سے بھی کسی کے متعلق مجھ
علوم نہیں ہو سکا ہے کہ انہوں نے اس کو شعائر میں سے شمار کیا ہو۔

اس کی تاریخ آغاز سے متعلق جو مواد موجود ہے اس سے قابلِ اعتماد بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہی
ہے کہ بیت اللہ کو غلاف پہنانے کا رواج زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاتھوں ہوا ۔ حضرت ابراہیمؑ
حضرت اسمٰعیلؑ کی طرف اس کی نسبت محض ایک بے تحقیق بات ہے ۔ اس کی کوئی قابلِ ذکر سند موجود
یں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات منقول ہے اس سے بھی یہی واضح ہے کہ غلافِ کعبہ کو
پنے حضرت ابراہیمؑ یا حضرت اسمٰعیلؑ کی سنت کی حیثیت سے اختیار نہیں فرمایا بلکہ زمانہ قبل از اسلام
ایک ایسی یادگار کی حیثیت سے باقی رکھنا پسند فرمایا جس میں کسی خاص دینی ضرر کا کوئی پہلو نہیں تھا ۔
ف پہنانے سے اصل مقصود کعبہ کا احترام تھا نہ کہ غلاف کا ۔ غلاف کے احترام کے معاملہ میں تو صحابہؓ کے
ر تک صورتِ حال یہ رہی ہے کہ پرانے غلاف جو اتارے جاتے عام لوگوں میں اُنکے ٹکڑے بیچ یا تقسیم کر دیئے
تے اور لوگ بلا کسی خاص امتیاز کے، عورتیں، مرد، بچے، عام کپڑوں ہی کی طرح ان کو استعمال کرتے۔
اس وجہ سے یہ خیال بالکل ہی بے بنیاد ہے کہ غلاف کعبہ شعائر اللہ میں سے ہے اور اس کی تعظیم بحیثیت
عیرہ کے ضروری ہے ۔ بس زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ عربوں نے بیت اللہ
ترام کے پیش نظر یہ رسم اختیار کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی پہلو سے اس کو باقی رکھنا
رمایا ۔ اس کے اختیار کرنے میں احترام خانہ کعبہ مدِ نظر تھا نہ کہ احترامِ غلاف ۔
عائر اللہ سے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ان کی دین میں بڑی اہمیت و عظمت ہے، اس

وجہ سے ہر چیز کا یہ درجہ نہیں ہو جاتا کہ اس کو ایک شعیرہ کا مقام دے دیا جائے۔ شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو دین کی کسی اہم معنوی حقیقت کا مظہر اور نشان (symbol) ہو۔ اس طرح کے نشانات مقرر کرنے کا حق ہما شما کو نہیں بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہے۔ ان کی تعظیم کے طریقے بھی اللہ اور رسولؐ ہی نے بتائے ہیں، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے جی سے ان کی تعظیم کے طریقے ایجاد کرے ورنہ اس سے دین میں بڑے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہماری تفسیر کی جو قسط میثاق کی اس اشاعت میں شامل ہے اس میں إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ کے تحت ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے قارئین اس پر ایک نظر ڈال لیں اس سے ان کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو سکیگا اور یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ اگر ہر شخص من مانے طور پر جس چیز کو چاہے شعائر اللہ کا درجہ دے کر لوگوں سے اس کی تعظیم کرانے لگے تو اس سے شرک و بدعت کے کیسے وسیع دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ہماری رائے تو اس باب میں یہ ہے کہ غلاف کعبہ کی زیارت اور اس کے مظاہرہ وجلوس کی باتیں تو الگ رہیں، اس کو شعائر دین میں داخل کرنا ہی بجائے خود ایک بدعت ہے۔ اس بات کو یاد رکھیئے کہ دین میں غلو بھی بدعت کا ایک دروازہ ہے۔ اگر ایک چیز کا وزن دین میں چھٹانک ہے تو بس اسی حد پر اس کو رہنے دیجیے اگر آپ نے اس چھٹانک کو سیر بھر کر دینے کی کوشش کی تو آپ بدعت کا دروازہ کھول دینگے۔ ادیان کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا کون شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اس قسم کے غلو نے شرک بدعت کے جو دروازے کھولے ہیں، شاید ہی کسی دوسری چیز نے کھولے ہوں۔

۲۔ بہرحال میرے اپنے علم کے حد تک تو غلاف کعبہ شعائر اللہ میں سے نہیں ہے اس وجہ سے میں بجائے خود اسی بات کو دین میں ایک اضافہ یا بدعت سمجھتا ہوں کہ اس کو شعائر اللہ میں داخل کر دیا جائے لیکن چلیئے، چھوڑیئے اس قصہ کو، میں نے تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا کہ یہ شعائر اللہ میں داخل ہے۔ اور ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب، اس کی تعظیم ہر مسلمان پر واجب ہے لیکن سوال یہ ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کچھ حدود و قیود مقرر ہیں یا اس باب میں ہمیں پوری چھوٹ حاصل ہے کہ ہم ان کی تعظیم اور ان کے احترام کے نام پر جو کچھ چاہیں کر ڈالیں جہاں تک میں نے قرآن و حدیث سے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ جس طرح شعائر اللہ، اللہ اور رسول کے مقرر کردہ

اسی طرح ان کی تعظیم اور ان کے احترام کے آداب و شرائط بھی اللہ اور رسول ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ اور ہمارے لئے، اگر ہم حدودِ دین کے اندر رہنا چاہتے ہیں، کسی حال میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان آداب و شرائط سے متجاوز ہو کر ان کی تعظیم اور ان کے احترام کی نت نئی شکلیں ایجاد کریں اور ان کو شرعی حیثیت دے کر نہ صرف یہ کہ خود ان پر عمل پیرا ہوں بلکہ دوسروں کے لئے بھی ان کو موجبِ سعادتِ دارین قرار دیں۔

میں اس حقیقت کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہوں۔ غلافِ کعبہ کو تو آج شعائر الٰہی میں داخل کیا گیا ہے، میں ایک ایسے شعیرہ کو لیتا ہوں جو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے وقت سے اہم ترین شعائرِ دین میں داخل ہے، جس کے شعائرِ دین میں سے ہونے پر کتاب و سنت دونوں ناطق ہیں اور جس کے بارے میں پوری اُمت کا اجماع ثابت ہے۔ میرا اشارہ ہَدی و نیاز کے اُن جانوروں کی طرف ہے جو خدا کے گھر کے لئے لے جائے جائیں۔ فرض کیجئے آپ کے شہر سے کچھ جانور اس مقصد سے مکہ روانہ کئے جاتے ہیں، کیا ان کے احترام کے نام پر ہمارے لئے یہ بات جائز ہوگی کہ پہلے ہم حضوری باغ میں سارے شہر کے مردوں اور عورتوں کے لئے ان کی زیارت کا اہتمام کریں، پھر شاہی مسجد سے علماء، قاریوں، نعت خوانوں اور موٹروں اور گاڑیوں کے جلو میں ان کا جلوس نکالیں، عوام کو ہدایت کریں کہ لوگ کلمہ پڑھتے ہوئے اور نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے اس جلوس کے ساتھ ساتھ چلیں، دوکانداروں کو تلقین کریں کہ وہ اس جلوس پر گلاب پاشی اور عطر پاشی کریں، حکومت کو آمادہ کریں کہ وہ اپنے دفاتر و مدارس بند کر کے لوگوں کے لئے اس جلوسِ سعادت میں شریک ہونے کا موقع بہم پہنچائے اور ہوائی جہازوں سے ان جانوروں پر گل باری کرے، ریلوے کے محکمہ سے مطالبہ کریں کہ وہ مخصوص ڈبے تیار کر کے کراچی سے پشاور اور پشاور سے ڈھاکہ تک شہر شہر میں ان مقدس شعائر کی عوام کو زیارت کرائے؟ 34188

ممکن ہے دنیا کے کسی دین میں یہ باتیں جائز ہوں لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس میں تو احترامِ شعائرِ الٰہی کی ان شکلوں کے جواز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے میں تو اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہوں کہ جس طرح غلافِ کعبہ کا شعائر اللہ میں داخل کرنا بدعت ہے اسی طرح اس کے احترام و تعظیم کی وہ شکلیں بھی تمام تر بدعت ہیں جو یہاں اختیار کی گئیں۔

تعظیمِ شعائرِ الٰہی کے ان نئے علم برداروں نے اپنے پمفلٹ میں شرک و توحید کا یہ نیا فلسفہ جو پیش کیا ہے کہ جو کچھ خانہ کعبہ سے باہر شرک ہے وہ اس کے اندر جا کر توحید بن جاتا ہے، میرے نزدیک یہ بھی

دین میں ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو ان تین سو ساٹھ بتوں کو خانہ کعبہ سے بیک بینی و دوگوش باہر نکلنا پڑتا جن کو عرب جاہلیت نے خانہ کعبہ کے اندر لا گھسایا تھا، بلکہ وہ بھی اس فلسفہ کی اکسیر سے اجزائے توحید و ایمان بن گئے ہوتے۔ لیکن ہوا یہ کہ اسلام نے اپنی جاء الحق وزہق الباطل کی خارا شگاف گرز سے ان کو اس طرح پاش پاش کر دیا کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ میرے نزدیک یہ فلسفہ ان کے "حکمت عملی" کے فلسفہ سے بھی زیادہ گمراہ کن ہے لیکن میں اس وقت اس پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ تو اندر کا معاملہ نہیں بلکہ باہر کا معاملہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ باہر کا یہ شرک اندر پہنچنے سے پہلے ہی کس طرح توحید بن گیا۔

۴۔ اوپر میں نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان کی ذمہ داری تو براہ راست اُن حضرات ہی پر عاید ہونی چاہیے جنہوں نے اسلام میں اس نئی تعزیہ داری کے لئے یہ کچھ اہتمام کیا اور اس کو باضابطہ اپنے اقامت دین کے پروگرام میں شامل کر کے پاکستان کے ہر حصہ میں اس کی سربراہی کی۔ رہیں وہ باتیں جو عوام نے کیں تو ان کے لئے عوام کو قصوروار ٹھہرانا ہمارے نزدیک ان حضرات کی بڑی زیادتی ہے۔ ہم تو عربی کی اس مشہور ضرب المثل کے قائل ہیں کہ "جب صاحب خانہ طبلہ بجانا شروع کر دے تو گھر کے بچوں کو ناچنے اور گانے پر ملامت نہ کرو"، جب دین میں اتنی بدعتیں دین کے علمبرداروں نے داخل کر دیں تو آخر عوام اس میں حصہ لینے کی سعادت سے کیوں محروم رہتے، انہوں نے بھی جو کچھ سمجھ میں آیا کیا۔ جو قوم مزارات اور قبروں کے آگے سجدے کرتی، منتیں مانگتی، دعائیں اور فریادیں کرتی ہے اگر آپ نے اس دھوم دھام اس تزک و احتشام اور اس تقدیس و احترام کے ساتھ اس کو غلافِ کعبہ کی زیارت کرائی تو اس کی محرومی و بدبختی ہی تھی اگر وہ یہ کچھ نہ کرتی جو اس نے کیا۔ ہمیں تو اس بات پر ذرا بھی حیرانی نہیں ہے کہ لوگوں نے غلافِ کعبہ کی گاڑی کو بوسے دیئے اور اس کو سجدے کئے، اس پر پھینکے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیوں کو تبرک اور ذریعہ شفا سمجھ کر حرزِ جاں بنایا، اس سے عورتوں نے اپنے برقعے اور مردوں نے اپنی چادریں چھو کر برکت اور صحت حاصل کی، اس سے بیماروں نے تندرستی، بے اولادوں نے اولاد اور ضرورتمندوں نے اپنی ضرورت مانگی۔ بلکہ ہمیں تو اس بات پر بھی ذرا تعجب نہیں ہوا کہ لاہور میں غلافِ کعبہ کو داتا دربار میں پیش کر کے اس کی تقدیس کو دوچند کیا گیا، اور بعض شہروں میں اس کا باقاعدہ طواف ہوا، اسی طرح جیو

نذرانے پیش کرنے پر بھی کوئی حیرانی نہیں ہے۔ البتہ حیرانی ہے تو اس بات پر ہے کہ نذرانے کی رقم صرف پانچ ہزار ہی تک کیوں پہنچی۔ جو دریادل قوم لاکھوں روپے مزاروں اور قبروں کے مجاوروں کے قدموں میں ڈال دیتی ہے آخر وہ غلاف کعبہ کے مجاوروں کا حق ادا کرنے میں اپنی روایتی دریادلی کیوں بھول گئی۔

۴۔ غرض ان باتوں میں سے ہمیں کسی بات پر کوئی حیرانی نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہر عقلمند آدمی کو معلوم تھا کہ اس پردہ کے پیچھے یہی کچھ ہو سکتا ہے اور یہی کچھ ہوگا، صرف ابلہ یا خود غرض ہی اس سے کچھ الگ اندازہ کر سکتے تھے، البتہ ایک بات پر ہمیں حیرانی ضرور ہے کہ ان حضرات نے پہلے تو بڑی شیوا بیانی اور بڑی رطب اللسانی کے ساتھ عوام کے اس جوشِ عقیدت، اس رکوع و سجود، اس تقبیل و استلام اور اس دعاء و استرحام کی تفصیلات خود اپنے اخبارات میں چھاپیں اور خلق کو ڈاکٹر اقبالؒ کے الفاظ میں یہ بشارت سنائی کہ ع " ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی "
اور اس نمی کو فراہم کرنے کا سارا کریڈٹ یہ حضرات بلا شرکت غیرے خود ہی سمیٹ لینے کے لئے بیقرار نظر آتے تھے لیکن اب معلوم نہیں کیا حادثہ پیش آیا ہے کہ اپنی فراہم کردہ نمی کی اپجائی ہوئی فصل کو کاٹنے اور سمیٹنے کے لئے ان حضرات کے اندر وہ پہلا سا جوش و خروش نظر نہیں آ رہا ہے بلکہ یہ اس کی ساری ذمہ داری غریب عوام پر ڈال رہے ہیں۔ حالانکہ اب یہی موقع آگے بڑھ کر حوصلہ کے ساتھ کام کرنے اور کھتے بھرنے کا تھا۔

ہر زمین ہر چیز کی کاشت کے لئے موزوں نہیں ہوا کرتی۔ ایک زمانہ تک تو ہمارے یہ احباب اس زمین میں توحید کی کاشت کے لئے جدوجہد کرتے رہے لیکن تجربہ نے ان کو بتایا کہ اس سنبل کی کاشت کے لئے یہ زمین شور ہے۔ البتہ غلاف کعبہ کی برکت سے ان دوستوں پر اس زمین کی نئی صلاحیتوں انکشاف ہوا ہے۔ اب دیکھیے شرک و بدعت کی فصل اگانے اور بڑھانے میں ان کا دل کیا رنگ ہے۔ اس میدان کے دوسرے حریفوں کا ریکارڈ توڑتے ہیں یا اس میں بھی پسدی ثابت ہو کر خسر الدُّنیا وَالآخِرۃ کے مصداق ٹھہرتے ہیں۔

ایک آیت اور ایک حدیث سے غلط استدلال

اخبار ــ ــ ــ لاہور بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے مضمون "فتنہ تکفیر" میں مضمون نگار نے قرآن مجید کی آیت اور ایک حدیث پیش کرکے احمدیوں (مرزائیوں) کے مسلمان ہونے کا استدلال کیا ہے۔ کیا آپ احمدیوں کے خارج از اسلام ہونے کا یہ استدلال درست سمجھتے ہیں؟ اگر نہیں تو اپنی دلیل سے آگاہ کیجیئے گا تاکہ بندہ کے علم میں اضافہ ہو۔ ممنون ہونگا!

آیت یہ ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا[1]۔

حدیث یہ ہے۔

من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا وأکل ذبیحتنا فذلك المسلم[2]۔

جواب ۱:- اگر کوئی شخص ہم کو سلام کرے تو اس کے جواب میں ہم کو یہ کہنے کا تو حق نہیں ہے کہ تو مومن نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں اسے مسلمان ہی سمجھنا چاہیئے اور اس کے سلام کا اچھے لفظوں میں جواب دینا چاہیئے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کی یہ ہدایت ان لوگوں سے متعلق ہے جن کے حالات سے ہم بے خبر ہوں۔ یہ ہدایت ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جن کے حالات سے ہم باخبر ہوں اور جن کے بارے میں ہمیں یہ علم ہو کہ یہ لوگ اسلام کے بنیادی عقیدہ ختم رسالت کے منکر ہیں یا اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو انکار کے مترادف ہے۔ آپ نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے قرآن مجید میں دیکھ لیجئے یہ انہی لوگوں سے متعلق ہے جن کے بارے میں مسلمانوں کو پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ اگر قادیانی حضرات اس آیت سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ وہ یہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ جو شخص ان کی قادیانیت سے واقف نہ ہو وہ بے خبری میں ان کے سلام کا جواب دے سکتا ہے اور ان کو اس وقت تک مسلمان گمان کر سکتا ہے جب تک ان کے عقائد کا علم اس کو واضح طور پر نہ ہو جائے۔

۲:- آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے یہ صرف ان ظاہری اعمال کو بیان کرتی ہے جو ایک

[1] جو شخص تمہیں سلام کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔ [2] جس نے ہمارے طریقہ پہ نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلم ہے۔

شخص کے مسلمان سمجھے جانے کے لئے ایک اسلامی ملک میں ضروری ہیں - یہ حدیث عقائد سے بحث نہیں کرتی اس کی وجہ یہ ہے کہ عقائد کے معاملہ میں توحید اور رسالت کا اقرار ایسی بنیادی حقیقتیں ہیں کہ ان کے بغیر کسی شخص کے مسلم ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ رسالت کے اقرار کے لوازم میں سے یہ بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور رسول مانا جائے - اس حدیث کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ کوئی شخص رسالت اور توحید کا منکر ہوتے ہوئے بھی محض مسلمانوں کا ذبیحہ کھاکر یا خانہ کعبہ کی طرف نماز میں رخ کر کے مسلمان بن سکتا ہے -

انتخابات و تراجم

خالد مسعود صاحب

سائنس کی بنیادی کمزوریاں

"یہ مضمون بروس پی فاسٹر (Bruce P. Foster) کے ایک مقالہ Fundamental Limitation of Science) کی تلخیص و ترجمہ ہے۔ یہ مقالہ سائنس کرونیکل کراچی کے نومبر ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔"

ایک صدی میں سائنس نے انسان کو اپنی فلاح و بہبود اور اپنی تباہی پر اس حیرت انگیز سے قدرت بخشی ہے کہ اس سے لوگوں کے دلوں میں سائنس کی تعظیم کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ بعض اوقات تو یہ جذبہ اتنی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ خدا کی تعظیم کے جذبہ پر بھی غالب آجاتا ہے۔ پچھلے زمانہ میں لوگ جس طرح جادوگروں کو خوف و عزت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دیکھتے تھے اب سائنس نئی دیوی کے پروہتوں یعنی سائنس دانوں کو بھی انہی احساسات کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

سائنس کی اس عظمت کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومتیں اور عوام دونوں ہی سائنس دانوں سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ مشورہ اکثر تو انہی معاملات میں ہوتا ہے جن میں ان کا سائنسی علم کوئی رائے دے سکتا ہے لیکن بسا اوقات یہ مشورہ ایسے معاملات میں بھی لے لیا جاتا ہے جن کا سائنس سے کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ ہمارے عوام چونکہ سائنس کی کمزوریوں اور اس کی حدود سے ناواقف ہیں اسلئے وہ سائنسدانوں کی آراء کو بالکل غیر واجبی اہمیت دینے لگتے ہیں۔ اس طرز عمل کی نمایاں مثال مشہور سائنسدان البرٹ آئن سٹائن کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آئن سٹائن ایک عبقری تھا اور اس کا دریافت کردہ نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) سائنس کی ایک عظیم الشان فتح ہے تاہم

حقیقت ہے کہ ملکی یا بین الاقوامی سیاست میں اس کی رائے اکثر بالکل پھسپھسی ہوتی تھی مثال کے طور پر اس نے اسرائیل کی ریاست کے قیام کے لئے جس طرح بے تکان تائید کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلسطینی عربوں کی تمناؤں سے بالکل آنکھیں موند لی تھیں۔

یہ بات ہرگز تعجب خیز نہیں کہ فلسطین کے حالات سے آئن شٹائن بے خبر تھا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ ایک آزاد معاشرہ میں آئن شٹائن یا کسی بھی آدمی پر اظہار رائے کی کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ جو چیز قابل اعتراض ہے وہ وہ اثر ہے جو آئن شٹائن کے بیانات سے سیدھے سادے عوام پر پڑا۔ وہ اس کی عبقریت کے احساس کے تحت ایک سیاسی معاملہ میں اس کے بیانات کو بالکل غیر ضروری اہمیت دینے لگے۔

ایک ملک کی سیاسی زندگی میں سائنسدانوں کے حصہ لینے کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جو آج سے چند سال قبل امریکہ کے ایک مباحثے میں پیش آیا۔ بحث کا عنوان یہ تھا کہ آیا زندگی پر ایٹمی تابکاری کے اثرات کی موجودگی میں امریکہ کو ایٹمی تجربات جاری رکھنے چاہئیں یا نہیں؟ اس مباحثے میں ایک دوسرے کے مخالف بولنے والے امریکہ کے دو مشہور ترین سائنسدان پروفیسر پالنگ (Pauling) اور پروفیسر ایڈورڈ ٹیلر (Edward Teller) تھے۔ ڈاکٹر پالنگ کا دعویٰ یہ تھا کہ ایٹمی تجربات اگر فی الفور بند نہ کئے گئے تو بالآخر نسل انسانی پر تابکاری کے اثرات تباہ کن ہونگے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر ٹیلر کی رائے یہ تھی کہ ایٹمی تجربات خواہ موجودہ رفتار سے زیادہ بھی کر دیئے جائیں جب بھی ان کے اثرات اتنے معمولی ہوں گے کہ ہم ان کو بآسانی نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے متضاد بیانات سے عوام بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اسرائیل کے متعلق آئن شٹائن کی رائے سن کر تو آدمی بآسانی یہ کہہ کر نظر انداز کر سکتا ہے کہ وہ اسرائیل کے معاملہ پر کوئی سند نہیں تھا۔ لیکن پالنگ اور ٹیلر کا معاملہ دوسرا ہے۔ دونوں اپنے دعویٰ میں صاف ہیں، دونوں "تابکاری کے حیاتیاتی اثرات" کے کام پر نوبل پرائز جیت چکے ہیں، دونوں اس وقت اپنی ذہنی قابلیتوں کی معراج پر ہیں، دونوں کی دیانت اور اخلاص پر کسی کو شبہ نہیں[1]۔

---

[1] سائنس کے نظریات کا تمام تر دارومدار جیسا کہ فاضل مصنف آگے چل کر وضاحت کریں گے، تجربات کے نتائج پر ہے اور بظاہر یکساں معلومات سے دو سائنسدانوں کو ایک ہی نتیجہ تک پہنچنا چاہیئے۔ لیکن ڈاکٹر

پالنگ اور ٹیلر کے ان متضاد بیانات کے نتیجہ میں ملک کے اہل علم طبقہ نے دونوں سائنسدانوں کے اکٹھا ہونے اور باہم مل کر مجموعی تجربات کے نتائج کی روشنی میں تابکاری کے اثرات کا تعین کرنے کی ضرورت محسوس کی لیکن یہ مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو سکا کہ بالفرض دونوں پروفیسر اگر حیاتیاتی اثرات کے تعین پر متفق بھی ہو جائیں جب بھی اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ ایٹمی تجربات کو جاری رکھنے کے نتائج زیادہ ضرر رساں ہوں گے یا ان کو ختم کرنے کے خوفناک نتائج زیادہ نقصان دہ ہوں گے۔ یہ تعین بہرحال سائنس کے بس کا نہیں، اس کا فیصلہ ایک جمہوری نظام میں بالآخر عوام ہی کی اکثریت کو کرنا ہوگا۔ اس طرح کی پیچیدگیوں کے پیش نظر یہ امر اشد ضروری ہے کہ لوگ سائنس کی حدود سے واقفیت حاصل کریں اور صنعتی ترقی کے اس زمانہ میں سائنسدانوں کی آراء کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوں کہ ان میں کون سی بات سائنس کی ہے اور کون سی بات سائنس کے دائرہ سے باہر کی۔ سائنس کی محدودیت کا اندازہ کرنے کے لئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) پالنگ اور ڈاکٹر ٹیلر کے مابین اگر یہ اختلاف رونما ہو گیا تو اس پر انہیں مطعون نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کی رائے کو یکساں اہمیت دی گئی۔ عدالتی کارروائیوں میں بھی عام طور پر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک ماتحت عدالت کا فیصلہ ہائی کورٹ بدل کے رکھ دیتی ہے اور جب معاملہ سپریم کورٹ میں جاتا ہے تو وہاں پر مقدمہ ایک نیا ہی رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کی حالیہ مثال کرنل یوسف اور مسٹر گردیزی کا وہ مقدمہ ہے جو جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں پیش ہوا اور ہائی کورٹ سے ہوتا ہوا سپریم کورٹ تک پہنچا۔ عدالتوں کے ان متضاد فیصلوں کو بھی لوگ قابل اعتراض نہیں سمجھتے اور ججوں کے اختلاف کو ان کی معلومات کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں۔

مقدمات کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کتنی ہی مثالیں ان واقعات کی مل جائیں گی جن میں دستوری دفعات کے مفہوم اور ان کی فروعات کے تعین میں قانون دانوں کو مشکلات پیش آئی ہیں اور انہوں نے متضاد نتائج نکالے ہیں۔ یہاں بھی اس اختلاف کے لئے قانون دانوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔

البتہ جب معاملہ اسلامی شریعت اور فقہاء کے مختلف فیصلوں کا آتا ہے اس وقت ہمارے قاضی اور قانون دان، ہمارے سیاستدان اور پروفیسر سبھی ملا کو تنگ نظری کا طعنہ دینے لگتے ہیں۔ اس وقت نہ ملا کی امانت و دیانت کو وزن دیا جاتا ہے، نہ معلومات کے اختلاف کا الاؤنس اسے دیا جاتا ہے اور نہ اس کے استدلال کو کوئی سنتا ہے۔ معلوم نہیں ملا کے ساتھ یہ مخصوص سلوک مسٹروں کی کسی تنگ نظری کا نتیجہ ہے یا اس کے اسباب دوسرے ہیں؟

غ، م

جدید سائنس کی روشنی میں چند حقائق پیش نظر رہنے چاہئیں۔

سائنس کے نظریات کی بنیاد تجربات پر ہے

سائنس کا بالکل بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ اس کا تعلق انہی مادی اشیاء سے ہے جن کی مقدار کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ہر سائنسی مسئلہ میں فیصلہ کن امر ایک مادی پیمائش ہوتی ہے، خواہ یہ مسئلہ ہمارے طالبعلموں کے سیدھے سادے تجربات سے متعلق ہو یا آئن شٹائن کے نظریہ اضافیت کے پیچیدہ تجربات سے متعلق۔ اگر کسی نظریہ (تھیوری) کے ساتھ تجرباتی پیمائشیں مطابق نہیں ہوتیں تو اس کے نتائج دو ہی ہو سکتے ہیں۔ یا تو نظریہ میں حسب حال ترمیم ہو گی یا اسے رد کرنا ہو گا۔ تجرباتی ثبوت کی عدم موجودگی میں کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ منطق بھی اس نظریہ کو نہیں بچا سکتی۔ اس حقیقت کی ایک دلچسپ مثال ایک سائنسدان کا شہد کی مکھی کی پرواز کا مطالعہ تھا۔ اس نے اڑتی ہوئی مکھی کی تصویریں لیں، اس کے پروں کی حرکت اور دوسرے خصائص جمع کئے اور اس وقت کی ہوائی پرواز (Aerodynamics.) کی مسلمہ تھیوری پر مکھی کی پرواز کو منطبق کرنا چاہا۔ اس مطالعہ سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر ہوائی پرواز کی مسلمہ تھیوری صحیح ہے تو ان پیمائشوں کے ہوتے ہوئے مکھی کے لئے اُڑنا کسی طرح ممکن نہیں ہونا چاہیئے۔ چونکہ مکھی کی پرواز ایک ایسا مشاہدہ تھا جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے خامی لازماً پرواز کی تھیوری میں ہو سکتی تھی، لہذا اس تھیوری کو از سر نو ایسے طریقہ سے مدون کرنا پڑا جس سے اس کے تحت مکھی کی ..... پرواز کی توجیہ کی جا سکے۔

یہ حقیقت کہ سائنس کے نظریات کی عمارت مادی پیمائشوں پر قائم ہے، سائنس کی مضبوطی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے اور انسان دنیا کو فتح کرنے میں جتنی کامیابی بھی حاصل کر سکا ہے وہ سائنس کی اسی خصوصیت کا ثمرہ ہے۔ سائنسدانوں کے ہاں فیصلہ کن عدالت چونکہ مادی پیمائشیں ہیں لہذا وہ اپنے تمام قیاسات کو انہی کی کسوٹی پر پرکھ لیتے ہیں۔ تجربات کی روشنی میں اگر ایک نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے تو وہ اس کو رد کر کے ایک ایسا نظریہ قائم کر لیتے ہیں۔ جو تجربات سے مطابقت رکھتا ہو اس کے بعد انہیں پیچھے کی فکر نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنا قدم آگے کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔ سائنس کی یہ آسانی فلسفہ کو حاصل نہیں۔ فلسفیوں کے ہاں اپنے فیصلوں کو جانچنے کی کوئی مسلمہ بنیاد نہیں ہوتی، اس لئے متحارب فلسفیوں کے درمیان حق و باطل کا ایسا فیصلہ کرنا جس کو ساری دنیا تسلیم کرلے ناممکن

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ فلسفہ کے ہاں بیشمار مکاتیبِ فکر بن گئے ہیں اور ان میں ہمیشہ پھوٹ پڑی رہتی ہے۔

دوسرے پہلو سے سائنس کا یہی اصول کہ ہر سائنسی نظریہ لازماً تجرباتی پیمائشوں کا ساتھ دے گا، سائنس کے دائرے کو بہت محدود کر دیتا ہے۔ ایسی بے شمار مقداریں جو مادی طور پر ناپی نہیں جا سکتیں مثلاً حسن، ذوقی تسکین، جذبات، خوشی، دوستی وغیرہ اور ان کے نتیجہ میں انسانی سرگرمیوں کے بے شمار دائرے مثلاً شاعری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ، سائنس کی حدود سے باہر رہ جاتے ہیں جب کوئی شخص سائنس کو فلسفہ یا مذہب کے مقام پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو سائنس کی یہ کمزوری بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔

اگرچہ سائنس کی اس مجبوری کو سائنسدان شروع سے مانتے چلے آتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی بے شمار برکات کے باعث اس مجبوری کا شدید احساس کسی کو نہ تھا۔ گذشتہ ساٹھ برس میں طبیعیات میں جو نئی اکتشافات ہوئی ہیں ان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے کہ سائنسدانوں کے لئے یہ مجبوری واقعی بہت اہم ہے۔ مثال کے لئے ہم نیوٹن کے کلیات و حرکت پیش کریں گے۔

نیوٹن کی میکانیات

نیوٹن کے کلیاتِ حرکت سائنس میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اب تک دنیا ان کو مانتی چلی آتی ہے اور طبعیات کی ایک شاخ میکانیات (Mechanics) میں کتنے نظریات کی اٹھان اسی کی بنیاد پر ہے۔ نیوٹن کے ایک کلیہ کی رُو سے اگر کسی متحرک جسم کی موجودہ حالت اور اس کا معیارِ حرکت (Momentum جو اس کے وزن اور رفتار کا حاصل ضرب ہوتا ہے) معلوم ہو تو یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کسی خاص وقت میں اس جسم پر کون کونسی قوتیں اثر کر رہی ہوں گی اور مستقبل میں کسی وقت اس کی حالت اور معیارِ حرکت کیا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کسی چیز کی موجودہ طبعی حالت اس کی گذشتہ زمانہ کی تمام حالتوں کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیوٹن کا یہ نظریہ اسی قدر اہم سمجھا گیا ہے کہ جب تک کوئی نیا نظریہ اس کی شرائط کو پورا نہ کرتا ہو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریہ کی رُو سے ہماری کائنات ایک عظیم مشین ہے۔ اس کی آج کی حالت ان حالتوں کا لازمی نتیجہ ہے جن میں سے یہ کل، پرسوں اور گذشتہ ہر زمانہ میں گذر چکی ہے۔ اسی طرح

اس کا مستقبل بالکل معلوم ہے اور آج کی حالت کے لازمی نتیجہ کے طور پر سامنے آئے گا۔ لہذا دنیا کے کارخانے کو وجود میں لانے کیلئے تو واقعی ایک خدا کی ضرورت تھی لیکن اب جبکہ کائنات کی مشین متحرک ہوگئی ہے اس کے چلانے کے لئے کسی خدا کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ نیوٹنی میکانیات کا یہی وہ نظریہ تھا جس کی بنا پر انیسویں صدی کے ایک بڑے سائنسدان نے نپولین سے کہا تھا کہ "اب ہمیں خدا کی کوئی احتیاج نہیں"۔

جدید سائنس کا نظریہ

سائنس کی اسی مستحکم ترین بنیاد کو لے لیجئے اور دیکھئے کہ جدید پیمائشوں نے کس بے دردی کے ساتھ اس کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

اس زمانہ میں سائنسی فنون کی ترقی کے ساتھ صحیح ترین پیمائش کے طریقے بھی ایجاد ہوئے ہیں سائنس کی بنیاد تو ہے ہی پیمائشوں پر لہذا اس زمانہ میں ہر نظریہ سائنس کو بڑی شدید آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نیوٹنی میکانیات میں پیمائش کا انحصار دو مفروضوں پر تھا،

ایک یہ کہ پیمائش کرنے والے کے ذاتی رجحانات اور اس طرح کے داخلی اسباب کا پیمائش پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوسرے یہ کہ جس جسم کی پیمائش کی جارہی ہے وہ اگر کسی دوسری حالت میں بھی ہوگا تو اس کی پیمائش میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ جدید سائنس نے ان دونوں مفروضوں پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔ پہلے مفروضہ پر جدید طبیعیات کا یہ تبصرہ ہے کہ ایک ہی طبعی واقعہ کی حقیقت دو مختلف رفتار رکھنے والوں کو مختلف نظر آئے گی اور پیمائش کا کوئی ایسا طریقہ موجود نہیں ہے جس کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ فلاں دیکھنے والے نے اس واقعہ کا صحیح مشاہدہ کیا ہے۔ آئن شٹائن کا مشہور نظریہ اضافیت اسی مشکل کا حل ہے اور ہر طبعی واقعہ کے بیان میں مشاہدہ کرنے والے کی حالت کو بیان کرنا ضروری قرار دیتا ہے۔

جہاں تک دوسرے مفروضہ کا تعلق ہے اس نے سائنسدانوں کے لئے بڑی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں کیونکہ ایک جسم کو اس کی اصل حالت میں مشاہدہ کرنا اور اسی حالت میں اس کی پیمائش کرنا ہے۔ جدید تحقیقات نے سائنسدانوں کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ پیمائش کے دوران میں جسم پر جو روشنی پڑتی ہے وہی روشنی جسم کو اس کی سابقہ حالت سے متحرک کر دیتی ہے۔ یہ حرکت اگرچہ کم

ضیف اور ہمارے روزمرہ کے لئے ناقابل التفات ہوتی ہے لیکن معاملہ جب ایٹمی اجزا کی پیمائش کا ہوتا ہے تو وہاں پر یہی مشکل ایک سائنسدان کے لئے لاینحل مسئلہ بن جاتی ہے۔ وہ اگر کسی برقیہ (Electron) کی حالت متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کی حرکت تبدیل ہوجاتی ہے اور اگر اس کی حرکت دریافت کرنا چاہتا ہے تو اس کی سابقہ حالت برقرار نہیں رہتی۔

اسی مسئلہ کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ اگر کسی جسم کی موجودہ حالت دریافت کرنا سائنس کے بس میں نہیں تو اس کے مستقبل کے متعلق پیشینگوئی کرنا بدرجہ اولیٰ غیر یقینی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جدید نظریہ کے تحت کائنات کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو نیوٹنی میکانیات کے تحت بنتی ہے۔ نیوٹنی میکانیات کی رو سے کائنات ایک مشین ہے جس کے اجزا ایک لگے بندھے اصول کے مطابق ایک شکل اختیار کئے ہوتے ہیں جو پہلی شکلوں کا ایک لازمی نتیجہ اور اس کی مستقبل کی شکلوں کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن جدید تحقیقات کی رو سے اس کائنات کے اجزا بالکل بے ترتیبی سے حرکت کرتے ہیں۔ ان کی موجودہ شکلوں کا پہلی شکلوں سے کوئی تعلق نہیں اور ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ کہنا ناممکن ہے۔ البتہ ہر ایٹم کی بے نظمی اور مطلق العنانی کے باوجود بحیثیت مجموعی یہ کائنات بہت منظم اور بامقصد ہے۔

یہاں آکر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات میں جو نظم اور مقصدیت پائی جاتی ہے وہ بے ترتیب ایٹموں کے باہم ملنے کا محض ایک اتفاقی نتیجہ ہے یا ایک دانا اور حکیم خدا کی خدائی کا کرشمہ ہے جس نے ان ایٹموں کو بنایا اور اب ان سے خاص کام لے رہا ہے؟

تقریظ و تنقید

حقیقتِ عبُودیت

تالیف : امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ : مولانا صدرالدین اصلاحی

صفحات : ۱۳۲ قیمت ایک روپیہ ۳۵ نئے پیسے

شائع کردہ : مکتبہ تعلیمات ، رام پور ، یو۔پی (بھارت)

انسان کے اندر خدا کی عبادت کا جذبہ اگرچہ فطری ہے اور کوئی بھی متوازن ذہن کا آدمی فطرت کی اس صدا کو نظر انداز نہیں کر سکتا تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ عبادت کے صحیح تصور سے بہت کم لوگ آشنا ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کے اس دائرے میں بیشمار فکری و عملی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ عبودیت کی اصل شاہراہ سے لوگوں کو واقف کرنا انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

"حقیقتِ عبودیت" امام ابن تیمیہؒ کے رسالہ العبودیۃ کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے اس رسالہ میں انسان کی مذکورہ بنیادی ضرورت ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند اہم سوالوں کا جواب دیا ہے مثلاً عبادت کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے اصول و فروع کیا ہیں؟ یہ لفظ دین کے تمام کلیات وجزئیات کو محیط ہے یا دین کے کچھ شعبے اس کی حدود سے خارج ہیں؟ عبادت کی حقیقت اور اس کے اعلیٰ ترین مظاہر کیا ہیں؟ ایک بندے کے شرف و مجد کا منتہائے کمال عبادت ہی ہے، یا کوئی اور مقام؟ عبودیت کے موضوع کو اس کی پوری وسعت کے ساتھ بیان کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس مختصر رسالہ میں تقدیر کے بارے میں جبریہ و قدریہ کے نظریات پر تبصرہ، خدا و رسول کی محبت کا صحیح مفہوم، عبادت کے بارے میں انسانی فکر و عمل کی کوتاہیاں اور اس طرح کے دوسرے مباحث آ گئے ہیں۔ حضرت امامؒ کے زمانہ میں چونکہ تصوف کی راہ سے بیشمار فتنے پھیل گئے تھے اس لئے انہوں نے ان فتنوں پر بھی گرفت کی ہے۔ یہ تمام مباحث امام ابن تیمیہؒ کے قلم سے ہیں،

ان کی بحث قاطع اور بیان دلنشین ہے۔ یہ رسالہ تبصرہ نگار کی کسی تعریف و توصیف کا محتاج نہیں۔ اپنے مباحث کے اعتبار سے یہ رسالہ ایسا ہے کہ اسے پڑھا پڑھایا جائے۔ ہم فاضل مترجم کی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کی ضرورت آج شائد امام موصوف کے زمانے سے بھی زیادہ شدید ہی ہوگی کیونکہ عبادت کا صحیح اسلامی تصور آج کے فتنوں بھرے دور میں اس سے کہیں زیادہ اجنبی اور نامانوس بن کر رہ گیا ہے جتنا کہ اس عہد میں تھا"

ترجمہ کی زبان رواں دواں ہے۔ ترجمہ کے متعلق فاضل مترجم کی یہ وضاحت پیش نظر رہے کہ "ترجمہ لفظی نہیں، بلکہ آزاد ہے، جسے ترجمہ کے بجائے ترجمانی کہنا زیادہ صحیح ہوگا" بعض مقامات پر عبادت کے ربط کو واضح کرنے کے لئے کچھ الفاظ کا یا کسی مستقل جملہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح رسالہ کے آخر کے بعض مباحث ترجمہ میں حذف بھی کر دیئے گئے ہیں"

پاکستان میں کتاب کے ملنے کا پتہ اس پر درج نہیں۔

(خ-م)

حضرت عمرو بن العاصؓ

تالیف : سلام اللہ صدیقی جونپوری

صفحات : ۱۵۴ قیمت ۲ روپے

شائع کردہ : مکتبہ اسلامی ادب للہ پورہ (فاطمان) بنارس (ہند)

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ادارہ بتول ۴-اے۔ ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

تاریخ اسلام کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس میں نہایت جلیل القدر شخصیتوں کی زندگیوں کو کچھ ایسے رنگ سے پیش کیا گیا کہ لوگوں میں ان کے لئے نفرت کے جذبات خود بخود ابھر آتے ہیں۔ کتنی ہی ایسی بزرگ ہستیاں ہیں جن کے ناموں کے ساتھ اگر رضی اللہ عنہ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھ دیا جائے تو عوام چونک جاتے ہیں۔ یہ سب انہی تعصبات کی کرشمہ سازی ہے جو صدیوں سے ملت اسلامیہ

میں پھیلائے جاتے رہے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی شخصیت بھی انہی مظلوم شخصیتوں میں سے ایک ہے جن کے متعلق ذہنوں میں بے شمار شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ معتمد علیہ صحابی ہیں جنہیں امارت وسفارت کے مناصب پر فائز کیا گیا، عہد شیخین رض میں آپ اسلام کے استحکام کے لئے سینہ سپر رہے۔ مصر اور شمالی افریقہ میں اسلام پھیلانے میں جسقدر حصہ آپ کا ہے اور کسی کا نہیں۔ ان خدمات کے باوجود تاریخ میں اس جلیل القدر صحابی رسول کا دامن اس طرح داغدار کیا جاتا ہے کہ متعصبین کی جسارت پر تعجب ہوتا ہے۔

زیر نظر تالیف حضرت عمرو بن العاص رض کی سوانح حیات ہے۔ اس میں آپ کی شخصیت کو اس کے صحیح رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے آخر میں ان تمام اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا ہے جو آپ کے متعلق پھیلائے جاتے ہیں۔ مسئلہ تحکیم کے ذیل میں حضرت عمرو رض کو خاص طور پر مطعون کیا جاتا ہے لیکن فاضل مؤلف نے تمام واقعہ جس ترتیب سے لکھا ہے اس سے ذہن میں کوئی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

ہماری رائے میں کتاب کا یہ پہلو ابھی تشنہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رض نے وہ کیا طریقے اختیار کئے جن کی بنا پر اسلام کو فلسطین سے لیکر مغرب تک وہ استحکام حاصل ہوا کہ یہ علاقے عرب تہذیب و تمدن سے محض وقتی طور پر ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ آج تک ان پر عربی اثر برقرار ہے۔

کتاب فاضل مصنف کی قابل قدر کوشش ہے اور ہم ہر ایک سے اس کے پڑھنے کی سفارش کریں گے۔

(خ-م) ———————————

حکمت استخارہ

تصنیف : پروفیسر فضل احمد عارف ایم۔اے

قیمت : ۳۷ پیسے، قسم اعلیٰ : ۵۶ پیسے۔

ناشر : مکتبہ رشیدیہ۔ میاں چنوں۔ ضلع ملتان۔

اللہ تعالیٰ سے استعانت کرنا توحید کے ابتدائی مقتضیات میں سے ہے۔ ایک بندۂ مومن یوں تو ہر معاملہ میں خدا کی رہنمائی کا محتاج اور اس کی مدد کا طالب رہتا ہے لیکن بڑے اور اہم کاموں میں خدا سے استعانت کا خاص اہتمام کرنا شریعت کے منشا کے مطابق ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے استخارہ کا طریقہ اُمت کو سکھایا ہے۔ ۵۴ صفحات کے کتابچہ "حکمت استخارہ" میں استخارہ ہی سے متعلق تمام تفصیلات کو جمع کیا گیا ہے۔

فاضل مصنف نے استخارہ کا جو مفہوم بتایا ہے اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے ابتدا ہی میں اسے ان مشورہ طلب امور کے لئے مخصوص کرنے کی کوشش فرمائی ہے جن میں آدمی متردد ہو۔ حالانکہ اس ضمن میں انہوں نے بخاری کی جو حدیث نقل فرمائی ہے وہی اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے۔

استخارہ کی یہ تعریف بجائے خود محلِ نظر ہے کہ "استخارہ کا مقصد کسی اہم کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق ایک خاص طریق پر اشارۂ غیبی چاہنا ہے"! استخارہ کا مقصد کسی کام کے اچھے پہلو کے اختیار کرنے اور اس کے بُرے پہلو سے بچنے کی توفیق چاہنا ہے نہ کہ اشارہ غیبی چاہنا۔ اس لئے ہمارے نزدیک استخارہ کے درست یا ناموافق آنے کی جو علامات مصنف نے درج فرمائی ہیں وہ بھی کچھ غیر ضروری ہیں۔ فاضل مصنف استخارہ کی اہمیت و حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیمات کی حدود ہی میں متعین کر کے پیش فرما دیتے تو یہ بالکل کافی تھا۔ "مشائخ کرام" اور "ایک بزرگ" کے مبہم الفاظ کے ساتھ ان کے ارشادات نقل کر لینے سے کوئی چیز مستند نہیں ہو جاتی۔

کتابچہ کے آخر میں مصنف نے بعض بزرگوں کے مجرب استخارے جمع کر دیئے ہیں۔ ان "مجربات" کا بیان اتنا طویل ہے کہ استخارہ کا مسنون طریقہ اس میں کھو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ استخارہ کی غیر مسنون شکلوں کا معاملہ قابلِ غور اور اپنے استحباب کے لئے دلائل کا طالب ہے جو مصنف نے پیش نہیں کئے۔

＿＿＿＿＿＿＿＿ (ع - د)

محمد اللہ بہت پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمان پورہ۔ اچھرہ لاہور ۱۴ سے شائع کیا
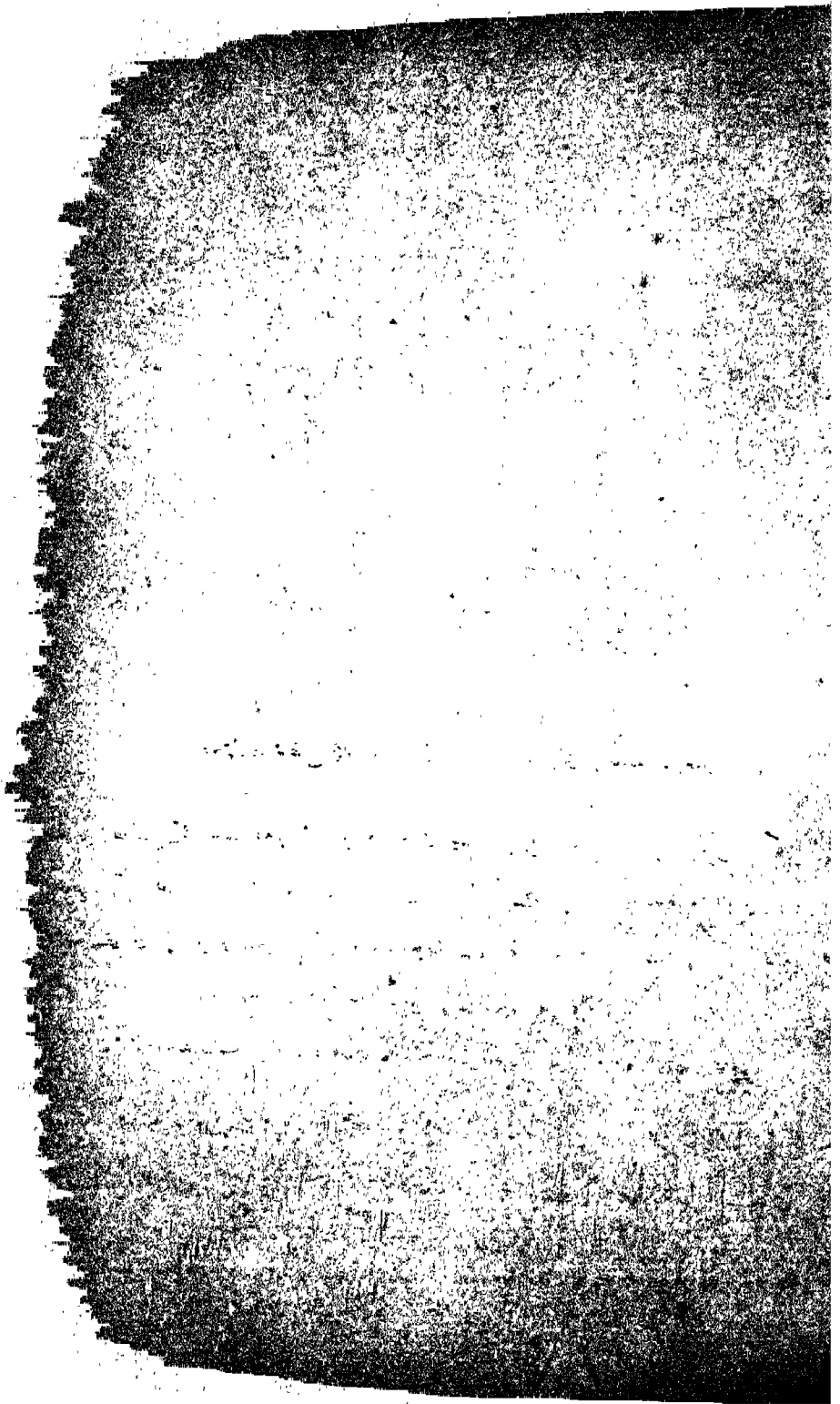
Monthly "MEESAAQ" Lahore

MAY, 1963
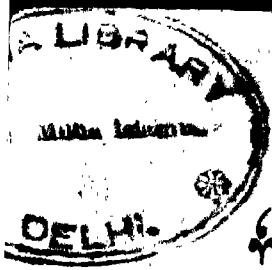
صرف سرورق گلشن آرٹ پریس، لاہور میں چھپا

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۹ | صفر المظفر ۱۳۸۳ ہجری | شمارہ ۱

فہرست مضامین

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ — اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیلِ زر
منیجر ہفت روزہ ندائے ملت
باغ گونگے نواب — لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

تذکرہ و تبصرہ

پچھلے دو مہینوں میں ہمارے ملک کے دونوں بازو دو مختلف قسم کے طوفانوں سے نہایت بُری طرح مجروح ہوئے۔ ہمارے لئے، اگر ہم دیدۂ عبرت رکھنے والے ہوتے تو اُن حوادث کے اندر بڑی نصیحتیں موجود تھیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارا حال اس وقت بالکل وہی ہو چکا ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۰۵ یوسف) "آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جو لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لئے ظاہر ہوتی رہتی ہیں لیکن لوگ ہیں کہ ان سے آنکھیں بند کئے گذر جاتے ہیں۔"

مشرقی پاکستان کے طوفان سے جو جانی و مالی نقصان ملک کو پہنچا ہے۔ اس کی مبالغہ آمیز رپورٹیں، جو سیاسی لیڈروں کی طرف سے اخبارات میں شائع ہوئی ہیں، اگر نظر انداز بھی کر دی جائیں، صرف سرکاری رپورٹ ہی پر اعتماد کیا جائے، جب بھی نقصانات کی مقدار ہوش اُڑا دینے کے لئے کافی ہے۔ وزیر خزانہ نے قومی اسمبلی میں نقصانات سے متعلق جو بیان دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طوفان سے ۱۳ ہزار مربع میل کا علاقہ، جو ۳۰ لاکھ کی آبادی پر مشتمل ہے، متاثر ہوا۔ سات ہزار تین سو افراد ہلاک ہوئے، چار ہزار افراد لاپتہ ہیں، ۲۵ ہزار مویشی سیلاب میں بہہ گئے، تین لاکھ جھونپڑے بالکل تباہ ہو گئے اور دس لاکھ جھونپڑیوں، ایک ہزار پرائمری اسکولوں اور چھ کالجوں کو جزوی نقصانات پہنچے۔

طوفان کی ہولناکی کا ایک سرسری اندازہ ذیل کی سطروں سے کیجئے جو ایک عزیز دوست کے
ے تازہ خط سے ماخوذ ہیں ۔

"چٹا گانگ میں اس مرتبہ جو طوفان آیا اس کا زور ساحلی علاقوں میں زیادہ تھا اور یہ
بان پہلے طوفان سے کہیں زیادہ ہولناک تھا ۔ ۲۷ مئی کی شام کو ہوا میں تیزی شروع ہوئی ۔
ر مئی کی رات میں جوں جوں رات بڑھتی گئی طوفان بڑھتا گیا اور ہوا کے ساتھ بارش میں بھی
افہ ہوتا گیا ۔ بارش وہ کہ معلوم ہو کہ طوفانِ نوحؑ کے لئے آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں،
کا زور وہ کہ معلوم ہو کہ قوم عاد کا عذاب ٹوٹ پڑا ہے ۔ ہوا اور پانی دونوں ایک دوسرے سے
م گتھے تھے اور ان کی اس جنگ میں معلوم ہو رہا تھا کہ بس اب اس دنیا کا خاتمہ ہے ۔ .... یہ
ان چودہ گھنٹوں کے بعد ختم ہوا ...... کاکس بازار سے فینی تک چھوٹے چھوٹے تمام جزائر
بادیاں موجوں کی نذر ہو گئیں اور ساحلی آبادیاں ہوا کے زوردار تھپیڑوں اور بارش کے بے پناہ
وں کے لپیٹ میں آکر موت کے آغوش میں پہنچ گئیں ۔ بس عبرت کے لئے کہیں کہیں کچھ
س بچ رہے ہیں لیکن عبرت کون حاصل کرتا ہے ؟ جو بچ رہے ہیں ان کے دل معلوم ہوتا
پتھر کے ہو گئے ہیں ۔ وہ لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے ۔ سابقہ طوفان کے بعد سے ہمارے
ر میں عموماً خدا سے بے خوفی بڑھتی جا رہی ہے ۔ کچھ ماحول ہی ایسا بنتا جا رہا ہے ......"

طوفان جیسا کچھ سخت تھا وہ تو تھا ہی اس سے زیادہ قابل ماتم وہ حالت ہے جو اس قسم کے کسی
ان قیامت کے بعد بچ رہنے والوں کی ہے اور جس کی طرف مکتوب نگار نے نہایت دل سوزی کے اشارہ
ہے ۔ اس طوفان سے پہلے بھی ہمارے یہ بھائی اسی قسم کے طوفان کی ہولناکیاں دیکھ چکے ہیں اور
ں کے بعد بھی اخبارات میں اسی علاقہ سے متعلق سیلاب کی تباہ کاریوں کی وحشتناک خبریں برابر
ہی ہیں ۔ لیکن اب ہمارے اوپر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطہ نظر اتنا غالب ہو چکا ہے کہ قدرت کی
ت سے سخت تنبیہ بھی ہمیں خواب غفلت سے جگانے کے لئے کافی نہیں ہوتی ۔ ہم میں سے
ر لوگ تو اس قسم کے حوادث کو صرف اتفاق پر محمول کر کے گذر جاتے ہیں، اس کے اسباب و
ں کی کرید میں پڑنے کی وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ لوگ اس کرید میں پڑنے کی زحمت

اُٹھاتے بھی ہیں تو ان کی نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی کہ محکمہ موسمیات نے طوفان کی پیشینگوئی کرنے میں غلطی کی، فلاں احتیاطی تدبیر اختیار کرنے میں حکومت نے سستی کی، فلاں دریا کا بند نہایت کمزور اور بے ڈھب باندھا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس پہلو کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی کہ اس کائنات کا کوئی خدا بھی ہے جس کو اس دُنیا کے معاملات سے براہ راست تعلق ہے اور جو کچھ بھی یہاں ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے اور نہ اس بات پر کوئی دھیان دیتا کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ اس میں اتنے بڑے بڑے واقعات محض نظام قدرت کی مشین کی کسی خرابی سے بس یوں ہی پیش آجائیں بلکہ ان کے سوتے خود ہمارے اپنے اخلاق و اعمال کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جھنجھوڑنے اور اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لئے برابر ان کو چھوٹی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ یہ آزمائشیں کبھی کسی کو پیش آتی ہیں، کبھی کسی کو لیکن قدرت کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس سے عبرت سب ہی حاصل کریں۔ وہ بھی جو اس ابتلاء کی زد میں آئے اور وہ بھی جو اس سے محفوظ رہے، بلکہ جو محفوظ رہے ان پر دُہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ایک عبرت حاصل کرنے کی اور دوسری شکرگزاری کی کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کو اس آفت سے محفوظ رکھا۔ ان دونوں باتوں کا تقاضا ایک تو یہ ہوتا ہے کہ یہ توبہ و اصلاح کریں اور دوسرا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی ایسی فیاضی اور ہمدردی کے ساتھ امداد کریں کہ اس شکرگزاری کا حق ادا ہو جائے جو اس آفت سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے ان پر عائد ہوتا ہے۔

جو لوگ ان واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کو خدا کی طرف سے سمجھنے کی بجائے ان کو محض اتفاق پر محمول کرتے ہیں، یا ان کی علت اپنے اعمال و اخلاق کے اندر ڈھونڈنے کی بجائے ان کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتے ہیں، یا اپنے آپ کو ان کا سزاوار سمجھنے کے بجائے اس چیز کو قدرت کا ایک ظلم سمجھتے ہیں، یا اس کو استحصال کا یا سیاسی پروپگنڈے کا ذریعہ بناتے ہیں، ان لوگوں کو قرآن قسی القلب اور سنگ دل قرار دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے

لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے یہاں تک کہ جب ان کے اندر خدا کی تنبیہات سے فائدہ اٹھانے اور توبہ و اصلاح کی صلاحیت بالکل مردہ ہو جاتی ہے تو وہ ان کو اپنے اس عذاب میں پکڑتا ہے جو ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے اور جس سے نجات دینے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔ اس عذاب کے بعد اس قوم کی قومی ہستی بالکل فنا ہو جاتی ہے اور خدا کا وہ قانون نمودار ہو جاتا ہے جو اس نے ایک قوم کو دوسری قوم سے بدل دینے کے لئے بنایا ہے۔

اس طرح کے عظیم واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے معاملہ میں مسلمانوں کو بالعموم اور ان کے ذمہ داروں اور لیڈروں کو بالخصوص جس درجہ حساس، زیرک، خداترس اور بیدار مغز ہونا چاہیئے اس کی بہترین مثال ہم کو حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں ملتی ہے۔ ان کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑا جس کا ذکر تاریخوں میں "عام الرمادہ" کے نام سے ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے اس قحط کے دنوں میں قحط زدوں کی امداد کے لئے اپنے رات دن ایک کر دیئے، ایک ایک دروازے اور ایک ایک جھونپڑے پر پہنچتے اور لوگوں کی مشکلات بنفس نفیس حل کرتے، راتوں کو گشت کرتے اور اگر کسی گھر میں بھوک سے بلکنے والے بچوں کی آواز سن پاتے تو خود اپنی کمر پر آٹے کی بوری لاد کر اور ہاتھ میں روغن کا ٹین لٹکائے ہوئے وہاں جا پہنچتے، خود چولہا پھونکتے اور جب تک بھوکے آسودہ نہ ہو جاتے اس وقت تک وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیتے۔ بھوکوں کے احساسات سے قریب تر رہنے کیلئے گھر کے اندر کھانا کھانا انہوں نے چھوڑ دیا۔ پورے زمانہ قحط میں اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر رکھی کہ نہ دودھ استعمال کریں گے، نہ گھی اور نہ کوئی میوہ لذیذ چیز۔ ایک دن اسی دوران میں اپنے کسی چھوٹے بچے کے ہاتھ میں خربوزے کی ایک پھانک دیکھ لی۔ دیکھتے ہی اس کے پیچھے بھاگے کہ "برخوردار! تم خربوزے اڑا رہے ہو اور امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قحط سے تباہ ہو رہی ہے" انتظامیہ کی سرگرمیوں کا اندازہ خود خلیفہ کی سرگرمیوں سے کر لیجئے۔ ان کا ایک ایک عامل اور ایک ایک گورنر انہیں کی طرح قحط کو شکست دینے کے لئے اپنی پوری قوت سے میدان میں اتر آیا۔ ان کے عراق کے گورنر نے ان کو لکھا کہ "امیر المؤمنین! آپ قحط کے حالات سے پریشان نہ ہوں، میں غلّہ کے اونٹوں کا جو قافلہ بھیج رہا ہوں اس کی قطار کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور اس کا آخری اونٹ عراق میں"۔

اس سرگرمی اور اس اہتمام و انتظام کے باوجود اب آئیے یہ دیکھئے کہ اس ابتلا سے متعلق، اور خود اپنی ذات سے متعلق ان کے احساسات کیا تھے؟ ان کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ راتوں کی تنہائی میں جب ذرا فرصت ملتی تو رو رو کر اپنی داڑھی تر کر لیتے اور توبہ و استغفار کے ساتھ اپنے رب سے یہ دعا کرتے کہ "اے پروردگار، اُمت محمدؐ میرے ہاتھوں تباہ نہ ہو"۔ اللہ اکبر! اس تدبر، اس انتظام اور اس طرح جان لڑا دینے کے بعد بھی تواضع، خشیت اور مقصود بخدمت کے احساس کا یہ عالم تھا کہ ڈرتے تھے اور روتے تھے کہ کہیں یہ ابتلا میری اپنی ہی کوتاہیوں کا نتیجہ نہ ہو۔

اس تمام گذارش سے ہمارا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مشرقی پاکستان میں یہ جو کچھ پیش آیا ہے یہ اتفاقی حوادث نہیں ہیں۔ اس دنیا میں کوئی چھوٹا سے چھوٹا واقعہ بھی اتفاق سے پیش نہیں آتا چہ جائیکہ یہ قیامت صغریٰ جس سے ۱۳ ہزار مربع میل کا رقبہ تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ بلکہ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لئے ایک بہت بڑی تنبیہہ ہے تاکہ ہم اس خدا کی طرف رجوع کریں جس نے اپنے فضل سے ہمیں ایک خطۂ زمین بخشا کہ ہم اس میں اس کی شریعت نافذ کریں لیکن ہم بدستور خدا اور اس کے دین کے ساتھ مذاق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس تنبیہہ کے مخاطب صرف مشرقی پاکستان کے مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے زیادہ ہم مغربی پاکستان کے مسلمان ہیں اس لئے کہ ہماری غفلتیں شائد ان سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہم نے اس تنبیہہ سے صحیح سبق حاصل نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ہم ان سے بھی زیادہ کسی سخت ابتلا میں ڈالے جائیں۔ پھر اس تنبیہہ کے مخاطب صرف عوام ہی نہیں ہیں بلکہ اس قوم کے خواص و اکابر اور زعماء، علماء اور ارباب اقتدار عوام سے بھی زیادہ ہیں اس لئے کہ جن خرابیوں کے نتیجہ میں اس طرح کے حوادث ظہور پذیر ہوتے ہیں ان کی اصلاح کی اصلی ذمہ داری چھوٹوں سے زیادہ بڑوں پر ہوتی ہے۔

اس قسم کے طوفانوں کا سدِ باب محکمہ موسمیات کی پیشینگوئیوں، حفاظتی بندوں اور سائنس کی پیش بندیوں، فوج اور پولیس کی کارفرمائیوں اور روس و امریکہ کی رہنمائیوں سے نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی سائنس اللہ کے مقابل میں کھڑی نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی تدبیر اس کی پکڑ سے بچا سکتی۔

بسبب کیجئے اور زیادہ سے زیادہ کیجئے۔ اس لئے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اس میں اسباب سے گریز ممکن نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی اسباب کی تا بہ حد مقدور فراہمی کی ہدایت فرمائی ہے لیکن اس غلط فہمی میں کبھی نہ پڑیئے کہ اسباب کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار خدا کے مقابل میں بھی کام آ سکتی ہے خدا سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو صرف سچی توبہ ہی بچا سکتی ہے۔ وہ توبہ جس کے ساتھ صلاح حال کا سچا اور پکا ارادہ ہو اور چونکہ یہ حوادث ہمارے اجتماعی فساد حال کی علامت ہیں اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم من حیث القوم اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں ہی قسم کی نافرمانیوں کی معافی مانگیں اور آئندہ سے اس راستہ پر چلنے کا عزم کریں جو خدا نے بتا یا ہے۔

مغربی پاکستان اگرچہ اس قسم کے کسی طوفان سے محفوظ رہا لیکن یہاں شیعوں اور سنیوں میں محرم کے موقع پر جو فسادات ہوئے ہیں ان سے ایک صاحب فہم کے لئے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں رہا ہے کہ اگر ہمارے ارباب حل وعقد فساد کے حقیقی اسباب کا پتہ لگانے میں ناکام رہے اور صرف اُوپر کی لیپ پوت یا صرف فوج اور پولیس کے ذریعہ سے انہوں نے آئندہ کے خطرات کے سدباب کی اُمید باندھلی تو یہ ایک ایسی غلطی ہوگی جس کی تلافی پھر کسی بھی دوسرے طریقہ سے نہ ہو سکے گی۔ یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ان فسادات کے اسباب نہ تو سرسری ہیں، نہ وقتی، نہ محدود، بلکہ ان کے اثرات بہت دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہ کافی تہ دار ہیں۔ اس وجہ سے حکومت کا فرض ہے کہ حالات کے مزید پیچیدہ ہونے سے پہلے پہلے اس معاملہ میں نہایت حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرے اور وقتی سکون سے کسی غلط فہمی میں پڑے بغیر صورت حال کا وہ علاج اختیار کرے جو اس کا مستقل اور پائیدار علاج ہے۔

اگر فسادات کی مذمت اور رواداری کی مدح و منقبت سے صورت حال کی اصلاح کی کوئی اُمید ہوتی تو ہم بھی اس خدمت کو بڑے شوق سے انجام دیتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اب معاملہ لفظی مدح و ذم کے حدود سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اور حکومت کی تدبیر و تدبر کا محتاج

اس وجہ سے ہم حکومت ہی سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے اور اس کو ادا کرے ۔ جہاں
ت رواداری کے مبہم وعظ کا تعلق ہے وہ اگر ہم کہیں بھی تو ہم نہیں جانتے کہ اس سے کس کو فائدہ
پہنچے گا ۔ ہماری آواز اگر کچھ پہنچ سکتی ہے تو سنیوں ہی تک پہنچ سکتی ہے اور وہ شاید ہمارے اس
وعظ کے محتاج نہیں ہیں ۔ جہاں تک اہل بیتؓ کی عقیدت و محبت کا تعلق ہے یہ چیز ان کے ایمان
عقیدے کا جزو ہے، اس کو بتانے اور سکھانے کی انکو ضرورت نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں تو وہ
دوسروں کی دیکھا دیکھی اس کے شرعی حدود سے آگے بڑھ کر بدعت اور غلو کے حدود میں داخل
ہو چکے ہیں ۔ آج تعزیوں کے جلوسوں اور عزا کی مجالس کی رونق بڑھانے میں سنیوں کے عوام تو
درکنار اُن کے علماء تک حصہ لیتے ہیں، اور دانستہ یا نادانستہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ تبرا کے بھی
مرتکب ہوتے ہیں جنہوں نے حضرت حسین کا ساتھ نہیں دیا . . . . . بڑھے
لکھے بلکہ علم دین کے دعویدار سنیوں تک کا حال یہ ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کو بے تکلف امام حسین علیہ
السلام لکھتے اور کہتے ہیں حالانکہ حضرت حسینؓ کے لئے امام کا لقب خالص شیعی تصور کا حامل ہے جس
کے جواز کی اہل سنت کے ہاں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اسی طرح علیہ السلام کا لفظ بھی صرف انبیاء
کے لئے مخصوص ہے لیکن سُنی حضرات اس کو بے تکلف حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے لئے لکھتے
اور بولتے ہیں ۔ تاریخ کے معاملہ میں بھی اہل سنت کے بہت سے علماء تک پر محض اہل بیت
کی عقیدت کے تحت شیعی نقطہ نظر اس قدر غالب ہے کہ جن حقیقت شناسوں نے ان کی اس
غلطی کی اصلاح کی کوشش کی ان پر ان سنی حضرات ہی نے فوراً ناصبیت کا فتویٰ جڑ دیا ——
ایسے حالات میں سنیوں کے سامنے اگر ہم رواداری کا مزید وعظ کہیں تو یہ چیز تحصیل حاصل ہی ہوگی
باقی شیعہ حضرات کا معاملہ تو ان سے ہم کچھ کہنے کے پوزیشن میں نہیں ہیں البتہ حکومت کے سامنے
یہ ظاہر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سنیوں کے جذبات حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ
حضرت عائشہ صدیقہؓ اور دوسرے صحابہ و صحابیات اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم اجمعین
کے معاملہ میں حد درجہ نازک ہیں، وہ ان بزرگوں کو مسلم طور پر اپنے لئے نمونہ ہدایت اور ان کی
محبت کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں ۔ بالخصوص حضرات شیخین رضی اللہ عنہما تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کے بعد ملت اسلامیہ کے دو ایسے ستون ہیں جن کے اُوپر ہمارے نزدیک بنائے ملت قائم ہے ۔

(باقی بر صفحہ ۱۴۵ پر دیکھیں)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۱۳)

اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْءِ .... مَا لَا تَعْلَمُوْنَ | "امر" کے معنی جس طرح کسی بات کا حکم دینے کے ہیں اسی طرح کوئی بات سمجھانے یا اس کا مشورہ دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً

امرتھم امری بمنعرج اللوی فلم یستبینوا الرشد الا ضحی الغد

میں نے اُن کو اپنے مشورہ سے منعرج اللوی ہی میں آگاہ کر دیا تھا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں دوسرے دن کی صبح سے پہلے نہ آسکی۔

یا

اطعت الآمریک بصرم حبلی

تو نے بالآخر انہی لوگوں کی بات سنی جو تجھے مجھ سے قطع تعلق کا مشورہ دینے والے تھے۔

"سوء" کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے جسمانی اور مادی نقصان اور گزند بھی مراد ہوتا ہے۔ مثلاً فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْءٌ ۱۷۳ - آل عمران (اور وہ خدا کی نعمت اور اس کا فضل لے کر لوٹے اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا) اس سے بیماری بھی مراد ہوتی ہے مثلاً وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ ۱۲ - نمل (اور تم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرو، وہ اس کے اندر سے سفید برآمد ہوگا بغیر کسی

رقص کے) اسی طرح یہ بدی اور گناہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، عام اس سے کہ بدی چھوٹی ہو یا بڑی مثلاً اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ ۱۷ - نساء (اللہ کے ذمہ ان کی توبہ کی قبولیت ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھیں پھر فوراً توبہ کر لیں)

فحشاء کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے کی قسم کی برائیوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ جب سوء اور فحشاء دونوں لفظ ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو یہ نہ صرف تمام چھوٹی بڑی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کے مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات و مصائب بھی ان کے تحت آجاتے ہیں۔

قول علی اللہ اور افتراء علی اللہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی خدا کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا ساجھی اور شریک قرار دیا ہے یا بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے فلاں فلاں قسم کی چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔

شیطان کے امر کرنے سے یہاں مطلب اس کا ان باتوں کے لئے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنا اور نگاہوں میں لکھانا ہے اور شیطان کے مفہوم میں اس کی ساری ذریت شامل ہے، عام اس سے کہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ یہی مضمون ایک دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ۭ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰۗـــِٕــهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱ - انعام (اور وہ چیزیں نہ کھاؤ جن پر خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے، بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں۔ اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے)

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ رحمان اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی و فطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو ان کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آسکتا۔ اوپر والی آیت میں گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لئے جائز ٹھہرائی ہیں وہ اپنے اثرات، اپنے ظاہر اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوشگوار، معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں اس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ سب کی سب

روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اس واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی اختیار کریں ان کی شامت ہی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا .... لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ | یعنی ان تمام مشرکانہ رسوم کے معاملہ میں ان کا اعتماد کسی دلیل اور سند پر نہیں بلکہ محض پچھلوں کی تقلید اور ان کی بے سند روایات کی پیروی پر ہے اور جب ان کو اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ ان بے سند باتوں کی جگہ اس کتاب کی پیروی کرو جو خدا کی اصل شریعت سے آگاہ کرنے کے لئے تم پر نازل کی جارہی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بدستور اپنے باپ دادا کے طریقہ پر جمے رہیں گے۔ اس پر قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا باپ دادا کے طریقہ کی پیروی پر ان کا یہ جمود اور اصرار اس شکل میں بھی معقول قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ یہ واضح ہو کہ ان کے باپ دادا نے نہ تو ان معاملات میں عقل کی رہنمائی پر اعتماد کیا ہے نہ خدا کی تعلیم پر بلکہ یا تو بے سمجھے بوجھے پچھلی لکیر پیٹتے رہے ہیں یا اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی ہیں؟

قرآن کے اس سوال کے انداز سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجرد یہ چیز کہ ایک بات باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر اس کو رکھ کر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بات اگر مجرد عقل و رائے سے تعلق رکھنے والی ہے تو وہ عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں اور اگر دین سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس کی کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد سند ہے یا نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قرآن ایک طرف تو مجرد تقلید پر اعتماد کرنے کے بجائے تحقیق اور تنقید کے لئے برابر آنکھیں کھولے رکھنے کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف وہ ماضی کے ورثہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھنے کی بھی ہدایت کرتا ہے اور بغیر تحقیق و تنقید اس سے دستبردار ہوجانے کی اجازت نہیں دیتا۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ .... فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ | نَعَقَ يَنعِقُ کے معنی چیخنے اور آواز دینے کے آتے ہیں۔ نعق المؤذن کے معنی ہیں مؤذن نے اذان دی۔ نعق الراعی بغنمہ کے معنی ہیں چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا یا پکارا۔

یہ ایک تمثیل ہے جس میں ایک صورت حال کی دوسری صورت حال سے تمثیل دی گئی ہے

اس طرح کی تمثیلات میں، جیسا کہ ہم آیات ۱۷ - ۱۸ کی تمثیلات کی وضاحت کرتے ہوئے بلکہ چکے ہیں، ممثل اور ممثل بہ کے تمام اجزاء کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی بلکہ صرف صورت واقعہ کی صورت واقعہ سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جس چیز کی تمثیل دی جا رہی ہے اس کی پوری صورت واضح کی جائے بلکہ صرف اس صورت واقعہ کی وضاحت ضروری ہوتی ہے جس سے تمثیل دی جاتی ہے۔ اُسی کے آئینہ میں اس کا عکس بھی دیکھ لیتے ہیں جس کی تمثیل پیش کرنی مقصود ہے۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر اڑ گئے ہیں، ان کی تشبیہ بھیڑوں بکریوں کے گلے سے دی گئی ہے جو عقل و ادراک سے بالکل عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتا ہے، چرواہے کی آواز بے شک اس کے کانوں سے جا ٹکراتی ہے لیکن اس سے آگے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ چرواہا کس کام کے لئے پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اس تمثیل کے بعد فرمایا کہ "یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں" جس سے مقصود اس امر کی وضاحت ہے کہ یہ تمثیل تمام عقلی اور روحانی تقاضوں سے اُن کی محرومی کی تمثیل ہے۔ اسی اسلوب کی بعض بلاغتیں آیت ۱۸ کے تحت بھی گذر چکی ہیں۔

| يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا .... إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ | یہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر یہ

مشرکین اپنی مشرکانہ بدعات پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم ان ناروا پابندیوں کو اُٹھا کر ان تمام پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں۔ پھر فرمایا اگر تم اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو اسی کے شکر گزار ہو۔ اس کے بخشے ہوئے رزق اور اس کے پیدا کئے ہوئے چوپایوں کو کسی اور کی نسبت سے حرام ٹھہرانا خدا کی بندگی کے بھی منافی ہے اور اسی کی شکر گذاری کے بھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر مخاطب کر کے یہ بات کہنے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ کھانے پینے کا معاملہ، بالخصوص جب کہ ایسی چیزوں کے کھانے کا معاملہ ہو جن کو پرانے زمانہ سے مذہبی تقدس کی بنیاد پر حرمت کا درجہ حاصل رہا ہو، ایک نازک معاملہ تھا، اس طرح کے معاملات میں انسان کچھ شکی اور وہمی سا بن جاتا ہے۔ روایت کے خلاف کسی چیز کے کھانے سے طبیعت میں نہ صرف

یہ کہ ایک قسم کی جھجک پیدا ہوتی ہے بلکہ بعض لوگ اس کو تقوی اور دینداری کے بھی خلاف سمجھ
ہیں۔ شروع شروع میں یہ حالت کچھ مسلمانوں کو بھی پیش آئی اس وجہ سے قرآن نے ان کو یہ تنبیہہ کی
یہ چیز خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی کے منافی ہے۔

سورۂ انعام کے بعض مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو
جب قرآن نے مباح کر دیا کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے کی صورت میں تم ان کو شوق سے کھاؤ
مشرکین نے یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے جو باپ دادا
کے زمانوں سے حرام چلی آ رہی تھیں چونکہ اس طرح کے معاملات میں طبیعتیں، جیسا کہ اوپر گزرا
بڑی حساس ہو جاتی ہیں اس وجہ سے کچھ مسلمانوں پر اس پروپگنڈے کا اثر پڑا۔ سورۂ انعام کی آ
ذیل میں اسی پروپگنڈے کا رد ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ۝ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ۝ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ

پس جن پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے ا
گیا ہو ان کو بے جھجک کھاؤ، اگر تم اس کی آیتو
پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور آخر تم ان چیزوں
کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جبکہ و
چیزیں تمہارے سامنے وضاحت سے بیان ک
جا چکی ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں الا آنکہ تم
ان میں سے بھی کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جا
بہت سے لوگ اپنی من گھڑت باتوں کی آ
لے کر بغیر کسی علم کے لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے
ہیں۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے حدود الٰہی
سے تجاوز کرنے والوں کو۔ گناہ ظاہر اور گناہ باطن
دونوں سے باز آؤ جو لوگ گناہ کی کمائی کر رہے
ہیں وہ اپنی کمائی کا عنقریب بدلہ پائیں گے۔ اور
ان چیزوں میں سے نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ

اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ ۝ (۱۱۸ - ۱۲۱ - انعام) لیا گیا ہو، یہ خدا کی نافرمانی ہے۔ اور یہ شیاطین ہیں جو اپنے دوستوں کو القا کر رہے ہیں تاکہ وہ تمہارے ساتھ بحثیں اُٹھائیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث بھی بالکل اسی موقع و محل میں اور مسلمانوں کے سامنے اِس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہے۔

| اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ .... غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ | یہ اشارہ ہے ان چیزوں کی

طرف جو اصلاً ملت ابراہیم علیہ السلام میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں اور مقصود اس سے ہرگز ہرگز حرام حلال کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مشرکین کی تردید ہے کہ انہوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، ملت ابراہیم علیہ السلام میں صرف یہ یہ چیزیں حرام تھیں۔ بالکل اسی سیاق میں یہی بات سورۂ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّكُوۡنَ مَیۡتَةً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُهِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰهِ بِهٖ ۱۴۵۔ (کہہ دو کہ مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لئے میں بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت، یہ چیزیں ناپاک ہیں۔ یا پھر خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے۔)

" قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡمَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ " کے الفاظ پر ان کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مشرکین کے سامنے اس بات کی وضاحت کرائی جا رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، مجھ پر ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے ضابطۂ حلت و حرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ فلاں فلاں چیزوں کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ٹھہرائی گئی۔

بعض لوگ زیر بحث آیت کو اس کے موقع و محل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ

کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لئے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں جو تفصیل آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں۔ پھر بعض دوسری چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ان بیان کردہ چیزوں میں سے مردار، خون اور لحم خنزیر کی حرمت تو ان کی ظاہری گندگی کے سبب سے ہے اس لئے کہ اسلام میں صرف پاکیزہ چیزیں ہی جیسا کہ اوپر اشارہ گذرا، حلال ٹھہرائی گئی ہیں، جو چیزیں دیکھنے ہی سے گندی اور نجس محسوس ہوتی ہیں ان کو اس دین فطرت میں حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ رہی غیر اللہ کے ذبیحہ کی حرمت تو اس کی حرمت کی وجہ اس کی باطنی گندگی ہے۔ یہ حقیقت اسلام میں اپنی جگہ پر بالکل مسلّم اور واضح ہے کہ شرک سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے اس وجہ سے اگر کسی پہلو سے اس کی چھوت کسی پاک چیز کو بھی لگ جاتی ہے تو وہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ان دونوں قسموں کی نجاستوں کی طرف اشارہ خود قرآن ہی نے کر دیا ہے چنانچہ انعام ۱۴۵ میں مردار، خون اور لحم خنزیر کے ذکر کے بعد فرمایا کہ فَإِنَّهُ رِجْسٌ، یہ چیزیں اس وجہ سے حرام ہیں کہ یہ نجس ہیں اور غیر اللہ کے ذبیحہ کا ذکر أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ کے الفاظ کے ساتھ کیا جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کی نجاست ظاہری نہیں بلکہ عقلی اور عقائدی ہے۔ پھر سورۂ انعام میں انہی مسائل کے بیان کے سلسلہ میں دین کی یہ ایک بہت بڑی حقیقت بھی واضح کر دی کہ اسلام کا مطالبہ اپنے ہر پیرو سے صرف گناہ ظاہری کے چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ گناہ باطنی کے چھوڑنے کے لئے بھی ہے اس وجہ سے ظاہری گندگی سے آلودہ چیزوں کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی گندگی سے ملوّث چیزوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (انعام) اسی ضابطہ کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا۔ '' اضطر " ضریضر سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق 'ض' کی مناسبت سے افتعال کی 'ت' 'ط' سے بدل گئی ہے۔ ضرہ إلی کذا کے معنی ہیں الجأہ الیہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنی ہیں احوجہ والجاہ اس کو فلاں چیز پر مجبور کر دیا۔ بغی یبغی کے معنی یہاں چاہنے اور

طلب کرنے کے ہیں - 'غیر باغ ولا عاد' یہاں حال پڑے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ 'اضطرار' کے ساتھ مخمصہ
کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی
جان بچانے کے لئے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو۔ نہ تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت
کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھنے والا ہو جس حد تک بڑھنا جان بچانے کے لئے ناگزیر ہو۔
ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اٹھائے تو فرمایا
ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ غفور رحیم ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اس حالت اضطرار کے لئے ایک رخصت ہے جو غذا میسر
نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اسی پر قیاس کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص حالت اکراہ میں
مبتلا ہو جائے وہ بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن بعض فقہا نے اس حد
سے بڑھ کر اس کو عزیمت کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک تو وہ شخص خودکشی کا مجرم ٹھہرے
گا جو اس طرح کے حالات میں حرام سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے
گا۔ ہمارے نزدیک اس اجمال کے ساتھ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک تفصیل
بھی ہے جس کے سامنے آئے بغیر اس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم آگے مستقل عنوان
سے یہ تفصیل پیش کریں گے تاکہ رخصت و عزیمت کے معاملہ میں اسلام کا جو مزاج ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ ...... وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ | یہ اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جس
طرح مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض چیزیں حرام ٹھہرا لی تھیں اور اسلام کی
طرف سے ان کی تحلیل کو خلاف تقویٰ و طہارت قرار دیتے تھے اسی طرح اہل کتاب نے بھی اپنے جی سے
حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے لیا تھا اور اب جبکہ اسلام حرام و حلال کے معاملہ میں اس ضابطہ کی طرف
لوگوں کو لوٹا رہا تھا جو توہمات و بدعات کے بجائے ملت ابراہیم (علیہ السلام) کی اساس اور وحی
الٰہی کی رہنمائی پر مبنی تھا تو یہ لوگ اس کی تائید کرنے کی جگہ کتاب الٰہی کی باتوں کو چھپاتے تھے۔
اس طرح کی ایک سے زیادہ چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہود اونٹ کے متعلق دعویٰ
کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حرام ہے حالانکہ تورات میں اس کا کوئی ثبوت
موجود نہیں تھا چنانچہ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ

صَادِقِیْنَ ، فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

۹۳-۹۴- آل عمران (ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو تورات لاکر پیش کرو۔ جو اس کے بعد بھی خدا پر جھوٹ باندھیں تو وہی لوگ اصلی ظالم ہیں)

اسی طرح بعض چیزیں یہود پران کی سرکشی اور کٹ حجتی کے سبب سے یا ان کے سوال درسوال کی بیماری کے باعث حرام ہو گئی تھیں لیکن اس طرح کی حرمتوں سے متعلق ان کو یہ آگاہی دے دی گئی تھی کہ جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو وہ تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزوں کو حلال کر دیں گے اور جو قیدیں اور بندشیں تم پر آج عائد ہیں یہ سب دُور ہو جائیں گی لیکن یہود نے اس معاملہ میں بھی حق پوشی اور کفرانِ نعمت کی وہی روش اختیار کی جو ابتدا سے ان کی روش تھی۔ انہوں نے ان چیزوں کی تحلیل کو آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا احسان قرار دینے کے بجائے اس کو دینداری اور تقوٰی کے خلاف قرار دیا اور اس کی آڑ میں، قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب مخالفت کی۔

اس باب میں بعض جرائم نصاریٰ کے بھی بڑے شدید ہیں۔ اگرچہ ان کا جرم تحریم سے زیادہ تحلیل کی نوعیت کا ہے۔ پال نے جو موجودہ مسیحیت کا بانی ہے یہ فلسفہ پیش کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے احکام غیر بنی اسرائیل پر واجب نہیں ہیں اسی طرح اس نے مسیحیوں کے لئے شراب بھی کھلے بندوں جائز کر دی اور خنزیر اور گلا گھوٹے ہوئے جانور کو بھی ان کے لئے مباح کر دیا۔

ان اہل کتاب کے متعلق قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ جو حق پوشی کر رہے ہیں اور اپنی دُنیا بنانے کی خاطر دین کو جو بیچ رہے ہیں یہ سودا ان کو بڑا مہنگا پڑے گا۔ دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے، یہ آگ ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اور اب قیامت کے دن نہ تو خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، اب ان کے لئے اذیت ناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

بات نہ کرنے کا مطلب ظاہر ہے کہ لطف وعنایت کی بات نہ کرنا ہے۔ گویا فعل کی نفی سے مقصود غنی فعل کی نفی ہے۔ دوسری جگہ اس سلسلہ میں وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ کے الفاظ بھی ہیں اس سے بھی مراد نگاہِ التفات کی نفی ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خدا جس قوم کو کتاب و شریعت

یتا ہے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لئے اس کے اندر اپنا نبی بھیجتا ہے تو یہ بھی نبی کے واسطہ سے
اللہ تعالیٰ گویا اس قوم کو اپنے شرف تکلم سے نوازتا ہے۔ پھر خاص طور پر بنی اسرائیل کو تو یہ شرف
بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پیغمبر کو اپنے خطاب کے شرف سے نوازا۔ اس عظیم عزت افزائی
اتقاضا یہ تھا کہ یہود دل وجان سے خدا کی شریعت اور اس کے کلام کی قدر کرتے اور گوشے گوشے
یں اس کا چرچا پھیلاتے لیکن جب انہوں نے اس کو شرف سمجھ کر اس کو پھیلانے کی جگہ اس کو
عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی تو اب ان کا کیا منہ رہ گیا ہے کہ خدا ان کو قیامت کے دن پھر
پنے شرفِ خطاب سے نوازے۔

"اور نہ ان کو پاک کرے گا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور کتاب کی نعمت سے اسی لئے
وازا تھا کہ ان کو پاکیزہ بنائے لیکن جب انہوں نے اس نعمت کے باوجود گمراہیوں اور آلودگیوں ہی
یں لتھڑے رہنا پسند کیا تو اب خدا ان کو آخرت میں پاک نہیں کرے گا۔ آخرت میں پاک نہ
کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت تزکیہ وتطہیر کا محل نہیں ہے بلکہ جزا وسزا کا محل ہے
س وجہ سے وہاں کسی کے تزکیہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں
کی ان بداعمالیوں کے سبب سے چونکہ ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے اس وجہ سے ان کو یہ موقع بھی
نہیں حاصل ہوگا کہ یہ دوزخ میں اپنے اعمال کی سزا بھگت کر اور پاکیزہ ہو کر جنت میں جا سکیں۔
بلکہ ان کے لئے دائمی عذاب ہوگا اور یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلم شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ
وسلم نے بوڑھے زانی، جھوٹے بادشاہ اور گدائے متکبر کو بھی داخل کیا ہے۔ یہ حدیث اس آیت
کی تفسیر نہیں بلکہ اشتراک علت کی وجہ سے آیت کے حکم کی توسیع ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ ...... فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ | فَمَا اَصْبَرَ' کا اسلوب مااحسن کی طرح اظہار
تعجب کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس دیدہ دلیری کے ساتھ ہدایت کی جگہ ضلالت اور مغفرت
کی جگہ عذاب کو ترجیح دے رہے ہیں تو دوزخ کے معاملہ میں ان کی ڈھٹائی اور جرأت حیرت انگیز ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ...... لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ | یہ اس ناراضگی اور غضب
کا سبب بیان ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب کے

مستحق اسی وجہ سے ٹھہریں گے کہ خدا نے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے ایک ایسی کتاب اتاری جو تمام جھگڑوں اور سارے اختلافات کو چکا دینے والی ہے لیکن انہوں نے اس کے بعد بھی ہدایت کی جگہ ضلالت ہی کو اختیار کیا تو یہ اسی بات کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے خدا کی نظر التفات سے محروم ہو کر اس عذاب میں پڑیں جس سے ان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو۔

اس میں "بِالحق"[۵۱] کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ خدا نے یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اُتاری ہے یعنی اہل کتاب نے حق پوشی و تحریف کر کے اللہ کے دین میں جو طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیئے تھے اور جس کے سبب سے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا کہ کیا حرام ہے، کیا حلال اور کیا حق ہے اور کیا باطل، اللہ نے قرآن کے ذریعہ سے اس اختلاف و نزاع کو بالکل رفع کر دیا، اب حق کی راہ ہر طالب حق کے لئے پھر کھل گئی ہے اور خدا کی شریعت اپنی صحیح اور مکمل شکل میں لوگوں کے سامنے آ گئی ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ انہی جھگڑوں میں پڑے رہیں تو ان کی شامت اور بدبختی ہی ہے۔

شقاق کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے یَاقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ مِّثْلَ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ الآیۃ ۸۹ - ہود (اے میری قوم کے لوگو، میری مخالفت اور دشمنی تمہارے لئے اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تمہارے اوپر بھی اسی طرح کا عذاب آ دھمکے جس طرح کا عذاب قوم نوح پر آیا) شقاق کے ساتھ جب بعید کی صفت لگ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی شخص یا چیز کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی شخص اس قدر آگے بڑھ جائے اور اتنی دُور نکل جائے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ ہوش نہ رہ جائے، اور نہ پھر اس کے لئے اتنی دور سے پلٹنے اور تلافی مافات کرنے کا کوئی امکان ہی باقی رہے۔ ان اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ تورات کے بعد اب قرآن میں بھی انہوں نے یہ جو اختلاف کیا ہے یہ محض ان کی ضدم ضدا کا کرشمہ ہے اور یہ اب اس راہ میں اتنی دُور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے واپس لوٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

۵۷۔ رخصت اور عزیمت کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر

آیت ۱۷۳۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ کی وضاحت کے ضمن میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اس شخص کے لئے کسی حرام سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا لینے کی رخصت ہے

---

[۵۱] لفظ حق کے مختلف معانی کی تحقیق آیت ۱۷ کے تحت ملاحظہ ہو۔ یہاں مراد قول فیصل ہے۔

جس کی بھوک کے سبب سے جان پر آبنی ہو اور زندگی بچانے کی کوئی اور صورت حرام کھا لینے کے سوا اس کو نظر نہ آ رہی ہو۔ قرآن کے الفاظ فلا اثم علیہ (ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں) اور ان اللہ غفور رحیم (اللہ ایسی حالت میں بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے) صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مجبوری کے حالات کے لئے ایک رخصت ہے۔ اسی وجہ سے ہم ان فقہا کی رائے کے بارے میں متردد ہیں جو اس رخصت کو عزیمت کا درجہ دیتے ہیں اور اس شخص پر خودکشی کا حکم لگاتے ہیں جو اضطرار کی حالت میں حرام سے فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے نتیجہ میں اس کی جان چلی جائے۔
ہمارے نزدیک یہ بات اس اجمال کے ساتھ، جیسا کہ ہم آیت کی تاویل کرتے ہوئے ظاہر کر چکے ہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رخصت بہرحال رخصت ہے۔ کسی رخصت کو مطلق طور پر عزیمت کا درجہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایک شخص اضطرار کے باوجود حرام سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی موت حرام کی موت ہوئی۔
اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو رخصتیں رکھی ہیں وہ سب اس کی مہربانی اور رحمت کا مظہر ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں اور ہماری مجبوریوں سے سب سے زیادہ باخبر ہے اس وجہ سے اس نے ہم پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالا ہے جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اس نے وضو کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر سفر کی حالت ہو، پانی نہ دستیاب ہو سکتا ہو یا بیماری کے سبب سے وضو کرنے میں مضرت کا اندیشہ ہو تو آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ اس نے نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ رخصت بھی عنایت فرمائی کہ سفر کی حالت میں آدمی قصر کر سکتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دیا تو یہ اجازت بھی دی کہ اگر روزے کے مہینہ میں سفر پیش آ جائے یا آدمی بیمار پڑ جائے تو دوسرے دنوں میں اپنے روزے پورے کرے۔ اس طرح کی رخصتیں دین کے ان تمام احکام کے ساتھ مذکور ہیں جن کی تعمیل کے کسی مرحلہ میں کوئی ایسی مشکل پیش آ سکتی ہے جو عام قوت برداشت سے زیادہ ہو۔ ان کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت پیش آ جانے پر ان سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں خواہ مخواہ اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص مضرت کے اندیشہ کے باوجود تیمم کے بجائے وضو پر اصرار کرے یا رخصتوں کے باوجود سفر میں اتمام نماز ہی کو

تقاضائے تقویٰ سمجھے یا مشقت کے باوجود سفر کی حالت میں بھی روزے پورے کرنے کو عزیمت جانے تو ہمارے نزدیک ایسا شخص اسلام کا اصلی مزاج سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ دین کے معاملہ میں تشدد پسندی ہے اور جو شخص دین میں تشدد پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے اور رخصتوں کو خلاف عزیمت جانتا ہے وہ درحقیقت دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے اور ایسا شخص حدیث میں وارد ہے کہ دین سے شکست کھاجاتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تنبیہ فرمائی جو سفر میں روزے کی وجہ سے اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن اگر کسی شخص کو سفر میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں وہ بلاکسی خاص زحمت کے پوری نمازیں پڑھ سکتا ہے یا روزے رکھ سکتا ہے تو اس سے کسی گناہ کے لازم ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو حالت اضطرار پیش آجائے اور جان بچانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے تو عام حالات میں اسلام کا مزاج یہی تقاضا کرتا ہے کہ جان بچانے کی حد تک وہ اس حرام سے فائدہ اٹھائے۔ اس چیز کو نہ خلاف تقویٰ خیال کرے نہ خلاف عزیمت لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں جب ایک غیرت مند مسلمان کے شایان شان بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جان تو دیدے لیکن حرام کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کرے مثلاً اگر کسی جگہ فساق و فجار کے صاحب اختیار ہونے کی وجہ سے حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہو اور آدمی کوئی حرام چیز کھانے پر مجبور کیا جائے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ عزیمت کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کے لئے اپنی زندگی قربان کردے۔ یہ بازی کھیل کر وہ گنہگار نہیں ہوگا بلکہ ان شاء اللہ اپنی غیرت ایمانی اور احترام حقوق شریعت الٰہی کے صلہ میں شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ کم از کم علماء و مصلحین کے لئے تو ایسے حالات کے اندر یہی روش بہتر ہے۔ حضرات صحابہؓ نے مکہ کی ابتدائی زندگی میں جو تکلیفیں کلمۂ توحید کی خاطر اٹھائی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں! کتنے اصحاب نے اعدائے توحید کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور زندگی تو سب ہی حضرات کی خطرے میں رہی لیکن ان میں سے کسی ایک صحابیؓ کے متعلق بھی ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ انہوں نے جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے

نکالا ہو حالانکہ قرآن میں اس بات کی صریح اجازت موجود تھی کہ اکراہ کی صورت میں آدمی جان بچانے کے لئے کلمہ کفر کہہ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ نہ تو دین کی رخصتوں کو حقیر سمجھنے کا رجحان صحیح ہے اور نہ رخصتوں ہی کو عزیمت قرار دے دینے کا رجحان صحیح ہے بلکہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عام حالات میں جس طرح رخصتوں سے فائدہ اٹھانا مزاجِ شریعت کے مطابق ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی دین کا مطالبہ ہے۔

۵۸۔ آگے کا سلسلہ کلام آیت ۱۷۷

اوپر والے مجموعہ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، توحید کا بیان تھا۔ اب آگے والی آیت میں اس کے لوازم و ثمرات یعنی ایمان، انفاق، اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ایفائے عہد اور ہر طرح کے حالات میں حق پر استقامت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس طرح ہے کہ خدا کے ساتھ وفاداری کا حق مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لینے سے ادا نہیں ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے۔ چنانچہ اسی مسئلہ پر ان کے ہاں ایک مدت سے معرکہ جدال و قتال گرم ہے، گویا ان کے خیال میں اصل دین یہی ہے۔ بلکہ اس کے لئے فلاں فلاں چیزوں کی ضرورت ہے اس تمہید سے مقصود مسلمانوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ دین محض چند رسوم و ظواہر کا نام نہیں ہے بلکہ وہ زندگی سے نہایت گہرے تعلق رکھنے والے اعمال و اخلاق کا مجموعہ ہے اس وجہ سے وہ اگلی امتوں کی طرح صرف رسوم کے بندے بن کر نہ رہ جائیں بلکہ دین کی اصلی حقیقتوں کو اپنائیں جو یہ ہیں انہی کو اپنا کر وہ خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر سکیں گے۔ ان کے بغیر محبت و وفاداری کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اس روشنی میں آیت کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ "۱

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرلو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقروفاقہ، تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

۵۹۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

"بِرّ" کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو یا اللہ کے بندوں کا حق ہو۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا الیفہ بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف، ولا، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہوجاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بَرّ اور بار اس سے صفت کے صیغے ہیں بر بوالدیہ اس سعادتمند بیٹے کو کہینگے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ بَرّ بالقسم کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کردی۔ لہ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بَرّ کی صفت استعمال ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے بندوں کے جو حقوق اپنے اوپر لئے ہیں یا جو وعدے ان سے کئے ہیں وہ ان کو ایک ایک کرکے دنیا اور آخرت دونوں جگہ پورے کرنے والا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق وواجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے ہمیں ترجمہ کے لئے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کردے۔ ہم نے جو لفظ

لہ لفظ بِرّ کی یہ تحقیق زیادہ تر مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔

اختیار کیا ہے وہ ہمارے نزدیک ایک حد تک لفظ کی اصل روح کو ادا کرتا ہے۔

یہاں اصل بیان تو ایمان و انفاق اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس باب کی تمہید میں ہم بیان کر آئے ہیں، ان احکام و شرائع کے پہلو بہ پہلو تجدید دین کے تقاضوں کے تحت ان بدعات کی تردید بھی ہے جو اہلِ کتاب یا مشرکین نے شریعتِ الٰہی میں داخل کر دی تھیں اور جن کے سبب سے پوری شریعت یا تو مسخ ہو کر رہ گئی تھی یا صرف چند ظواہر اور رسوم کا مجموعہ بن گئی تھی۔ یہاں اسی تجدید دین کے تقاضے کے تحت اصل احکام کے بیان کی تمہید اس طرح اٹھائی کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کا حق صرف مشرق اور مغرب کی طرف مُنہ کر لینے سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ اصل شے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے جن کے ہاں تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو طاقِ نسیان پر رکھ دی گئی تھیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کا جھگڑا، جیسا کہ آیات ۱۱۵ اور ۱۴۲ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، ان کے درمیان اس طرح اُٹھ کھڑا ہوا تھا گویا سارے دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے۔

یہ تمہید جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اس اُمت کے لئے تنبیہ ہے کہ اسی طرح فروعی باتوں میں اُلجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہو جانا ورنہ یہود و نصاریٰ ہی کی طرح تم بھی مچھر کو چھاننے والے اور اُونٹ کے نگلنے والے بن کر رہ جاؤ گے اور جس طرح ان کا دعوئے خدا پرستی بے معنی ثابت ہوا اسی طرح تمہاری خدا پرستی بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ٹھیک اسی مفہوم کی تنبیہ آگے کے بیان کے سلسلہ میں بھی فرمائی ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۱۸۹۔ بقرہ (یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، تقوی تو اس کا ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے) ان تمام تنبیہات سے مقصود جیسا کہ عرض کیا گیا، اس اُمت کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی بدعات اور ظاہر پرستیوں سے بچا کر دین کی اصل حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ اُمت بھی انہیں وادیوں میں بھٹک کر رہ گئی جن میں پچھلی اُمتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ میں ایک مضاف عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے گویا پوری عبارت یوں ہوگی۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ مضاف کے حذف کی مثال خود اسی زیر بحث آیت میں موجود ہے۔ فرمایا ہے۔ وَفِي الرِّقَابِ۔ ظاہر ہے کہ یہ وَفِي فَكِّ الرِّقَاب

ہے۔ایمان سے یہاں سیاق وسباق دلیل ہے کہ حقیقی ایمان مراد ہے۔ اس لئے کہ حقیقی ایمان ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی خدا کی وفاداری کا حق ادا کرسکتا ہے۔حقیقی ایمان اللہ پر یہ ہے کہ آدمی بلا کسی شائبۂ شرک کے اپنے کو پورا پورا اپنے رب کے حوالہ کردے۔آخرت پر حقیقی ایمان یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر قول و فعل کا خدا کے سامنے جواب دہ سمجھے اور جھوٹی شفاعتوں کے وہم میں مبتلا نہ ہو۔فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہستی کو تسلیم کرے، ان کو معصوم اور قدسی صفت جانے، ان کو اللہ کی ہدایت لانے والا امین اور معتمد مانے اور ان کو قضا و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ سمجھے۔ایمان بالکتاب کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت مانے، اس کو حق و باطل کی کسوٹی سمجھے اور زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کرے۔نبیوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لئے اسوہ قرار دے اور ان کی اطاعت، اتباع اور محبت کو لازم جانے۔

یہاں ایک بات ممکن ہے بعض ذہنوں میں کچھ کھٹکے۔ وہ یہ کہ ایمان کے اجزاء میں فرشتوں پر ایمان کو کیوں داخل کر دیا ہے جب کہ ان کا تجربہ صرف نبیوں ہی کو ہوا ہے اور ان پر ایمان لانے کا کوئی خاص علمی یا عملی فائدہ ایک عام آدمی پر واضح نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کا حق آخرت، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے بغیر ادا نہیں ہوتا انہی چیزوں پر ایمان لانے سے ایمان باللہ ہماری زندگی کی ایک محسوس، موثر اور فعال حقیقت بنتا ہے اسی طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل کا ایک غیر منفک جزو ایمان بالملائکہ ہے۔ ملائکہ کو مانے بغیر خدا اور اس کے نبیوں کے درمیان کا واسطہ غیر واضح اور غیر معین رہ جاتا ہے جس کے غیر واضح رہنے سے نہ صرف سلسلۂ علم و ہدایت کی ایک نہایت اہم کڑی گم شدہ رہ جاتی ہے بلکہ ہدایت آسمانی کے باب میں عقل انسانی کو گمراہی کی بہت سی راہیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بات تو دنیا ہمیشہ سے مانتی آئی ہے کہ خدا ہے اور یہ بات بھی اس نے ہمیشہ محسوس کی ہے کہ جب وہ ہے تو اسے اپنی مرضیات سے بھی اپنے بندوں کو آگاہ کرنا چاہئے لیکن جب وہ کبھی بے نقاب اور رو در رو ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ذریعہ اور واسطہ کیا ہے جس سے وہ خلق کو اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لئے اس نے اپنے خاص خاص بندوں کو منتخب کیا ہے جن کو انبیاء و رسل کہتے ہیں تو بعینہٖ

یہی سوال ان کے باب میں بھی اٹھتا ہے کہ وہ ان نبیوں اور رسولوں کو اپنے علم و ہدایت سے آگاہ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ کیا رو در رو ہو کر خود ان سے بات کرتا ہے یا کوئی اور ذریعہ اختیار فرماتا ہے؟
اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان علم کا واسطہ وحی ہے جو وہ اپنے فرشتوں بالخصوص اپنے مقرب فرشتے جبریلؑ کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ یہ فرشتے خدا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور برتر مخلوق ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ راست خدا سے وحی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ خدا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں اور چونکہ خدا کے حکم و اختیار کے تحت اور اس کی نگرانی میں کرتے ہیں اس وجہ سے نہ تو کوئی اور مخلوق ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈال سکتی اور نہ وہ خود ہی اس میں کسی بھول چوک یا کسی غلطی کے مرتکب ہو سکتے۔ انہی کے زمرہ کی ایک مقرب ہستی حضرت جبریلؑ ہیں جو خدا کے ہاں سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور مقرب ہیں۔ قرآن میں ان کی صفت ذی قوت، مطاع اور امین بھی آئی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کے لئے تمام صلاحیتوں اور قوتوں سے بھرپور ہیں، دوسری قوتیں یا ارواح خبیثہ ان کو متاثر یا مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ان کے دائرہ کار میں سب بے چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکے، وحی الٰہی کی جو امانت نبیوں اور رسولوں تک پہنچانے کے لئے ان کے سپرد کی جاتی ہے وہ اس کو بے کم و کاست پہنچاتے ہیں، ممکن نہیں کہ اس میں کسی زیر زبر کا بھی فرق ہو سکے۔
وحی و رسالت کے ساتھ فرشتوں کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے لئے ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوا۔ یہ خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان رسالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ناگزیر ہیں کہ یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالم لاہوت اور عالم ناسوت دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں، یہ اپنی نورانیت کی وجہ سے خدا کے انوار و تجلیات کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں اور اپنی مخلوقیت کے پہلو سے انسانوں سے بھی اتصال پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور مخلوق خدا تک رسائی کا یہ درجہ اور مقام نہیں رکھتی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے جو خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان رسالت کا واسطہ ہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ عقل انسانی عالم لاہوت سے تعلق رکھنے والی ارواح کے تجسس میں ہمیشہ سے رہی ہے اور اس ضرورت کو اس نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اس تلاش میں اگر اس کو کوئی صحیح چیز نہیں مل سکی ہے تو جو غلط سے غلط چیز بھی اس کے ہاتھ آگئی ہے اسی کا دامن اس نے پکڑ لیا ہے۔ عرب کے کاہن اور ساحر جنات اور شیاطین اور ہاتف غیبی کو عالم لاہوت سے تعلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، ہندوستان کے جوتشی اور منجم ستاروں کی گردشوں کے اندر غیب کے اسرار ڈھونڈھتے تھے، چین کے مندروں کے پجاری اپنے باپ دادا کی ارواح کے توسط سے عالم غیب سے توسل پیدا کرتے تھے۔ قرآن نے ان تمام غلط وسائل اور واسطوں کی نفی کردی اور ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ علم کو رطب و یابس کا مجموعہ ٹھہرایا اور ساتھ ہی یہ حقیقت واضح فرمائی کہ علم الٰہی کا قابل اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیاء کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ بے کم وکاست ان کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان بالملئکۃ، ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں اور جس طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء ہماری زندگی کی نہایت محسوس حقیقتیں ہیں اسی طرح ایمان بالملئکہ بھی ہماری زندگی کی ایک نہایت اہم علمی و عملی حقیقت ہے۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ - میں ضمیر مجرور یوں تو خدا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے یعنی آدمی اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں خرچ کرے لیکن ہمارے نزدیک مختلف وجوہ سے ان لوگوں کا قول قابل ترجیح ہے جو اس کا مرجع مال کو قرار دیتے ہیں یعنی آدمی مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

مال کی محبت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود قیمتی اور دل پسند ہو، دوسرا یہ کہ آدمی خود اس کا ایسا ضرورت مند ہو کہ دوسرے کے لئے ایثار کرنا نفس پر شاق ہو رہا ہو۔ تیسرا یہ کہ زمانہ قحط اور گرانی کا ہو جس میں کشادہ دست آدمی بھی محتاط اور کفایت پسند بن جایا کرتا ہے۔ علی حبہ کا لفظ ان تینوں ہی صورتوں پر حاوی ہے۔ اس مفہوم کو ترجیح دینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ

یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بِرّ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفاداری کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو کس قسم کا انفاق کرنا چاہئیے۔ یہ مضمون دوسرے مقامات میں جہاں جہاں بیان ہوا ہے وہاں صراحت کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اس مال کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو محبوب ہو۔ مثلاً۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۹۲ ۔ آل عمران (تم کمال وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک اس مال میں سے خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) اسی طرح دوسرے مقام میں سچے اہل ایمان کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۹ ۔ حشر (اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو)

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کونسا ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔

تیسری یہ کہ اہل عرب کے ہاں بھی سب سے زیادہ قابل تعریف فیاضی انہی لوگوں کی سمجھی جاتی تھی جو زمانہ قحط و گرانی میں فیاضی کرتے تھے جبکہ مال مالداروں کی نظر میں بھی بڑی محبوب چیز بن جاتا ہے۔ عرب شعراء نے اس صفت کی بالاتفاق تعریف کی ہے۔ دوسری قوموں میں بھی یہ صفت بلا اختلاف ممدوح ہے۔

چوتھی یہ کہ اس طرح کا انفاق غالب یہی ہے کہ خدا کی محبت میں ہو، اس لئے کہ بغیر اس قوی محرک کے نفس کا اس قسم کے ایثار پر آمادہ ہونا بڑا مشکل ہے۔ اس پہلو سے یہ مفہوم پہلے مفہوم پر خود بخود حاوی ہو جاتا ہے۔

انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابتمندوں کو رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اعزا و اقربا، اگر وہ ضرورت مند ہیں، اس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ دل میں عداوت بھی چھپائے ہوئے ہوں جب بھی سب سے افضل انفاق، جیسا کہ اوپر والی حدیث سے واضح ہوا، وہی ہے جو ان کے لئے کیا جائے۔

قرابت مندوں کے بعد معاً یتامیٰ کا ذکر اسلامی معاشرہ میں ان کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد پہلی نظر آدمی کی ان بچوں پر پڑنی چاہیئے جو سایہ پدری سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کی کفالت و تربیت کی ساری ذمہ داری معاشرہ پر منتقل ہو چکی ہے۔

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافر مجرد اپنی مسافرت کی حالت کی بنا پر مستحق اعانت ہوتا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ صاحب استطاعت ہے یا غیر صاحب استطاعت۔ اگر مستحق اعانت ہونے کے لئے غیر صاحب استطاعت ہونے کی شرط ہوتی تو مسکین کے بعد اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مسکین کے مفہوم میں یہ آپ سے آپ شامل ہوتا۔

سائلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعانت کے لئے سوال کر بیٹھیں۔ مساکین کے بعد ان کے مستقل ذکر کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص سوال کر بیٹھے اس کے متعلق زیادہ کھوج کی ضرورت نہیں ہے کہ واقعی محتاج ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے ضرورت سوال کر رہا ہے تو اس کی جوابدہی خود اس کے اوپر اللہ کے ہاں ہے۔ ہمارا حق صرف یہ ہے کہ اگر ہم امداد کر سکتے ہوں تو ایسے شخص کی امداد کریں اور اگر معذور ہوں تو جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہدایت ہے شائستہ انداز سے اس کے سامنے اپنی معذرت پیش کر دیں۔

'وفی الرقاب' میں رقاب رقبہ کی جمع ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی فی فک الرقاب۔ گردنوں سے مراد یہاں غلاموں کی گردنیں ہیں جن میں ان کے آقاؤں کی خدمت کے طوق ہوتے تھے۔ ان کو اس طوق غلامی سے چھڑانا اور آزاد انسانوں کی سطح پر لانا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اس وجہ سے اسلام نے اپنی مدات خیر میں ان کو بھی شامل کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا معاملہ اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھا، وقت کے بین الاقوامی قانون جنگ کے تحت اسلام نے اس کو محض وقتی طور پر اس لئے گوارا کیا تھا کہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر جنگ کے قیدیوں کے مسئلہ کا کوئی اور حل موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کو گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے اپنے ماحول میں غلاموں کی آزادی کی مختلف نوعیتوں سے حوصلہ افزائی کی۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کو خرید کر آزاد کر دینے یا ان کی مکاتبت یعنی شرط آزادی کی رقم ادا کرنے کو ایک ثواب کا کام

ٹھہرا دیا۔

اب اس زمانہ میں غلامی اگرچہ قانوناً ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے لیکن عملاً آج بھی بے شمار انسان اپنی معاشی مجبوریوں اور خاص طور پر سودی قرضوں کی لعنت کے سبب سے ایسے بندھنوں میں گرفتار یا جیلوں میں بند ہیں کہ ان کو اگر غلام نہیں تو غلاموں سے مشابہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی گلو خلاصی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور کھیتوں کو چھڑانا بھی ان شاء اللہ فک رقبۃٍ ہی کے درجے کی نیکی ہے۔

اقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ - پر مفصل بحث اس کتاب کے شروع میں ہو چکی ہے۔ یہاں ایمان انفاق کے ذکر کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان دونوں کے قانونی و عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا۔ ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر عملی نماز ہے اور انفاق کی وسیع حقیقت کا مظہر قانونی زکوٰۃ۔ مطلب ان دونوں کے ذکر سے یہ ہے کہ ایمان اور انفاق کی شہادت دینے کے لئے کم سے کم جو چیز مطلوب ہے وہ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں غائب ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ایمان باقی رہا نہ انفاق درانحالیکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے بندہ خالق اور خلق کے ساتھ اپنے تعلق کو صحتمندانہ بنیاد پر قائم کرتا ہے۔

یہاں زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ بر و تقویٰ کا درجہ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ سراً وعلانیۃً فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

'والموفون بعھدھم' (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں) میں دفعۃً اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ اوپر ایمان، انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا تھا الموفون کا عطف تو انہی پر ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ پھر آگے 'الصابرین فی الباساء' (اور ثابت قدم رہنے والے) آرہا ہے جو ہے تو صفت کی صورت میں لیکن موفون، پر معطوف ہونے کے باوجود صابرون کے بجائے صابرین یعنی حالت نصب میں ہو گیا ہے۔

اسلوب کا یہ ردو بدل صرف تنوع کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معنوی فوائد بھی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

عربی زبان کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ عربی میں فعل کے صیغے تو صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت، کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر ایک عزم وجزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ سلسلہ کلام میں اگر کسی صفت کا ذکر بغیر کسی ظاہری سبب کے حالت نصب میں ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اس پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے ہمارے اہلِ نحو اس بات کو 'علی سبیل المدح' یا 'علی سبیل الاختصاص' کی اصطلاح میں تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہاں 'موفون' کے بعد دفعتہً اس سے بالکل مختلف اسلوب میں 'الصابرینَ' جزء آگیا تو اس سے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ گویا متکلم یہ کہنا چاہتا ہے کہ 'انا اخص بالذکر الصابرین' میں صابرین کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

اسلوب کی اس وضاحت کے بعد اب یہ سوال ذہن میں پیدا ہوگا کہ اوپر عقائد اور عبادات کا ذکر تو سیدھے سادے فعل کے صیغوں سے کیا، پھر یہ ایفائے عہد اور صبر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کا ذکر اسلوب بدل بدل کر اس اہتمام واختصاص اور اس تاکید وتنبیہ کے ساتھ فرمایا؟ اس کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رکھئے۔

ایک تو یہ کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق سیرت وکردار سے ہے۔ سیرت وکردار کا معاملہ بڑے عزم وجزم اور ریاضت وتربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری عقائد وعبادات کا تعلق ہے ان کو نبھانے والے تو دین کے زوال وانحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل مذاہب میں یہ کمزوری بہت نمایاں رہی ہے کہ انہوں نے عقائد وعبادات کے ظواہر پر تو بڑے بڑے معرکے دکھائے ہیں لیکن کردار کی تعمیر پر انہوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ یہاں چونکہ اس آخری امت کی رہنمائی مقام برّ واطاعت کی طرف کی جارہی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ یہ مقام بغیر اعلیٰ کردار کے جن میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت ہے، حاصل نہیں ہوسکتا۔

دوسری یہ کہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تمام عقائد وعبادات سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت وکردار

کی تعبیر ہی ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصود صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسموں کو بجا لانا ہی تو نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی و اجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے۔ یہ نہ ہو تو تمام عقائد و عبادات سمجھئے کہ بالکل بے جان و بے روح ہیں یہی نکتہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ عقائد و عبادات کے پہلو بہ پہلو اُن کے عملی اثرات کی طرف ضرور توجہ دلائی ہے تاکہ ان سے غفلت نہ ہونے پائے۔

تیسری یہ کہ امتحان و آزمائش کا اصلی میدان سیرت و کردار ہی کا میدان ہے۔ انسان کا اصل خزانہ جو وہ دین کی مدد سے فراہم کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط اور پاکیزہ سیرت ہی ہے۔ یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی مقام برّ و تقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے لئے ابرار و صالحین اور شہداء و صدیقین کی معیت کی ضامن بنتی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس پر خاص طور پر زور دیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کے لئے چوکنا رہے۔

ایک سوال یہاں اور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ یہاں سیرت و کردار سے متعلق صرف دو ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ایفائے عہد کا، دوسری صبر کا۔ اس فہرست میں اور بھی چیزیں شامل ہو سکتی تھیں، آخر ان کا ذکر کیوں نہیں فرمایا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت سیرت و اخلاق سے متعلق تمام اجزا کے لئے بمنزلہ شیرازہ ہیں۔ ایفائے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آجاتے ہیں خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ ان کا اعلان واعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے ہوئے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلہ، استاذ اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدہ کے تحت بندھے ہوئے ہیں اور یہ برّ و تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ان تمام معاہدوں کے حقوق ادا کئے

والے بنیں۔ گویا ایفائے عہد کی اصل روح ایفائے حقوق ہے اور ایفائے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔

اس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کر کے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفائے حقوق کی اس راہ میں حائل ہو مومن عزیمت و استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی یا خوف سے مغلوب نہ ہو۔

صبر کے لئے تین مواقع کا حوالہ دیا ہے۔ ایک بَأْسَاء کا جس سے فقر و فاقہ کی تکالیف مراد ہیں۔ دوسرے ضَرَّاء کا جس سے تکالیف جسمانی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے بَأْس کا جس سے جنگ کے حالات مراد ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا عزم انہی تین راہوں سے آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں حالتوں کے اندر موقف حق پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بر و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ - (یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے وفاداری میں سچے اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں) اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ جو لوگ محض چند خالی خولی ظاہر داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں، نہ متقی ہیں۔

ایک نکتہ یہاں اور بھی ملحوظ رہے وہ یہ کہ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ کے ساتھ إِذَا عَاهَدُوا کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے بھی اس عزم و استقلال کا اظہار ہو رہا ہے جو ان وفا پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو خواہ کچھ ہی ہو، اس کے سبب سے انہیں کیسے ہی نقصانات و آلام سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے لیکن وہ پیٹھ نہیں دکھاتے بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو پورا کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں جو رویہ رہا ہے وہ پوری تاریخ انسانی میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے خاص کر صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ابوجندل کے معاملہ میں معاہدہ کا جو احترام کیا وہ تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

افاداتِ فراہیؒ

امین احسن اصلاحی

شانِ نُزُول

شانِ نُزُول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسر موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدِ نظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو، اور وہ امر یا امور جن کو کسی سورہ میں مد نظر رکھا جاتا ہے، اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم کو شان نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم ہر سورہ سے اس سورہ کی شانِ نزول معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہو گی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزاء باہم دگر مربوط و متصل ہوں گے۔ اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل درپیش تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ سورہ کے نزول کے لئے محرکات اور اسباب موجود تھے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

۔ زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم استدلال

ہوتا ہے، اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورۂ انعام میں وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا ۔ الآیہ کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے۔ وہاں امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

> مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے۔"

پس ہمارے نزدیک، جیساکہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا صورت معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے وہ اس غرض کے لئے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر اگرچہ نظرانداز کر دیتا ہے لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام احوال و معاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے جیساکہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے چنانچہ فرمایا ہے وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ (اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت نزول میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دے دیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے تو وہ سورہ تمام کر دی جاتی اور ناممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضا سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔

لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی تو اس وقت دوسری سورۂ نازل کی جاتی۔ شانِ نزول وہی ہوتی لیکن اسلوب میں تبدیلی کر دی جاتی تاکہ یکسانی و یکرنگی سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے بعثت کی بہت سی سورتوں میں حشر و نشر، توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین

ملتے ہیں، صرف اسلوب اور طرزِ بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی اس وقت کوئی آیت اُترتی اور جہاں ضرورت ہوتی وہ آیت وہیں رکھ دی جاتی۔ یہ اس عہد کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی توضیح کرنا) ایسے مواقع پر زمانہ نزول کا لحاظ نہ ہوتا بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد تنبیہ بھی کر دی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں ان کے بعد بالعموم آیت آئی ہے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کو سمجھانے کیلئے کھولتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں)

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شانِ نزول کی تلاش میں سررشتہ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شانِ نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کریں۔ پھر سب سے زیادہ لائقِ اہتمام وہ سببِ نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہو۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ جب کوئی حکمِ عام کسی خاص حالت و صورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت و صورت اس حکم کی حکمت و علّت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعددِ ازواج اور وحدتِ ازواج دونوں کا حکم ہے اب اگر تم اس شانِ نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام سے نکلتی ہے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ پہلا حکم یتامٰی[1] کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور ان دونوں کے درمیان جامع رشتہ قسط بالضعفاء یعنی کمزوروں کے ساتھ انصاف ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہو گی جو مقدم ہے۔ یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے۔ کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دنائت کی بات ہے پس ضرورت کیلئے اس کی اجازت دی اور ضرورت رفع ہو جانے کے لئے اس کے لوٹا دینے کا حکم دیا۔

---

[1] بعض مرتبہ یتیموں کی پرورش یا اس قسم کی کوئی دوسری معاشرتی یا اخلاقی و اجتماعی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھے۔ (مترجم)

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

جمال عبدالنّاصر اور نعرۂ اتحادِ عرب

آپ نے مئی کے پرچہ میں عرب کی سیاسی کشمکش پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے۔ آپ نے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے وہ بہت سے شبہات بالکل صاف ہو گئے ہیں جو جمال عبدالناصر کے خلاف اس وقت عرب اور دوسرے مسلمان ملکوں میں پھیلائے جا رہے ہیں لیکن بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قومیت کا نعرہ اسلام کے خلاف ہے اس وجہ سے یہ نعرہ بلند کر کے جمال عبدالناصر ایک فتنہ کو جگا رہے ہیں جس سے مسلمانوں کے ملی اتحاد کو نقصان پہنچیگا۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ نعرہ اسلام کے خلاف ہے لیکن چونکہ آپ اس کی زد اسلام اور مسلمانوں پر نہیں سمجھتے بلکہ حکومت اسرائیل اور سامراجیوں پر سمجھتے ہیں اس وجہ سے آپ نے جمال عبدالناصر کے موقف کی تائید کی ہے۔ لیکن جو چیز اسلام کے خلاف ہے اور جس سے جاہلی نعروں کو تقویت حاصل ہونے کا اندیشہ ہے کیا یہ صحیح ہو گا کہ اس کو فروغ پانے کا موقع دیا جائے؟ میں یہ بات بطور اعتراض نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ اپنے ایک شبہ کا ازالہ چاہتا ہوں۔

جواب: - یہ بات صحیح نہیں ہے کہ قومیت کا شعور یا اظہار بجائے خود کوئی کفر ہے جس کے لئے اسلام میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قومیت کے بھی کچھ جائز اور فطری حقوق ہیں جن کو اسلام نے تسلیم کیا ہے اور ان کے احترام کی تاکید کی ہے۔ بلکہ ان کو اجزائے دین میں شامل کر لیا ہے۔ اس عنوان پر میرا ایک مفصل مضمون میثاق کی پچھلی اشاعتوں[1] میں نکل چکا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ "میثاق" بابت جون و جولائی ۱۹۶۰ء۔

اس کو نکال کر پڑھ لیجئے اس سے بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔ قومیت میں فساد اس وقت شامل ہوتا ہے جب یہ بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی بن جائے اور اس کا تعصب یہ جارحانہ اور کافرانہ روپ دھار لے کہ "میری قوم، خواہ حق پر ہو یا باطل پر"۔ کسی قوم کا اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے لئے متحد اور منظم ہونا یا اس مقصد کے لئے اس کو منظم ہونے کی دعوت دینا نہ کفر ہے نہ نعرۂ جاہلیت۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ بالکل بے سوچے سمجھے ایسا سمجھتے ہیں ۔

اگر عرب ترکوں کے خلاف یا ترک عربوں کے خلاف، مصری شامیوں کے خلاف یا شامی مصریوں کے خلاف، افغانی پاکستانیوں کے خلاف یا پاکستانی افغانیوں کے خلاف، مجرد اپنی عربیت یا ترکیت یا مصریت یا شامیت یا افغانیت یا پاکستانیت کے زعم میں نعرہ لگائیں اور اپنی قومیت ہی کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرالیں اور کسی بالاتر اصول حق و عدل کو یا اسلام کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو بلاشبہ ان کی قومیت خلاف اسلام اور ان کا نعرہ، جاہلیت کا نعرہ ہے لیکن اگر ان کے اندر اپنے کسی جائز حق کی مدافعت کے لئے شعور قومیت ابھرے تو یہ اسی طرح جائز بلکہ ثواب ہے جس طرح کسی خاندان کے لوگ اپنے ناموس کی حفاظت کے لئے کسی حملہ آور کے مقابل میں ایک مشترک جذبہ کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

اگر جمال عبدالناصر آج عربی قومیت کا صور اسی مقصد سے پھونکتے جس مقصد سے ایک زمانہ میں ترکوں کو مصر و حجاز سے بے دخل کرنے کے لئے انہی سامراجیوں نے مصر و حجاز اور شام میں پھنکوایا تھا۔ تب تو بلاشبہ وہ قابل ملامت تھے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت یہ صورت حال نہیں ہے۔ جمال عبدالناصر عربوں کو ترکوں یا افغانیوں یا پاکستانیوں کے خلاف نہیں منظم کر رہے ہیں بلکہ اسرائیل اور سامراجیوں کے خلاف منظم کر رہے ہیں، ان کے پیش نظر اسلام یا مسلمانوں کی مخالفت نہیں بلکہ عرب قوم کی مدافعت ہے، وہ جارح بن کر کسی پر حملہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ مدافع بن کر ایک عظیم خطرہ کے مقابل میں اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں ۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے بھی انہیں اسلامی اتحاد کی دعوت ہی کو ذریعہ بنانا چاہیے تھا تو یہ بات کہنے کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں کسی متحدہ اسلامی بلاک کی تنظیم کی راہ میں کتنی ناقابل عبور مشکلات ہیں۔ جب صرف عرب کے متحد ہونے

ہیں سامراجیوں نے اتنے اڑنگے ڈال رکھے ہیں تو پورے عالم اسلامی کے اتحاد کو وہ بھلا کب ممکن ہونے دینگے جبکہ عالم اسلامی میں سے ایک ایک ملک کی شہ رگ انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے حالات میں جمال عبدالناصر نے اگر اپنے کام کو عرب ہی تک محدود رکھا تو انہوں نے بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنی طاقت و صلاحیت کا انہوں نے صحیح اندازہ کیا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل کی صورت میں جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ براہ راست عرب ہی پر نازل ہوئی ہے۔ اس کا احساس جتنا ان کو ہو سکتا ہے ہم کو اور آپ کو نہیں ہو سکتا۔ ہم اور آپ تو زیادہ سے زیادہ کچھ زبانی ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن ان کے لئے تو یہ موت اور زندگی کا مسئلہ ہے اس وجہ سے عرب میں اگر کچھ رمق باقی ہے تو توقع یہی ہے کہ وہ اس خطرہ عظیم کے مقابل میں متحد ہو جائے گا۔ ورنہ تقدیر کے نوشتہ کو کون مٹا سکتا ہے!

آج جمال عبدالناصر پر فرعونیت کے احیاء کا الزام جو دھرا جا رہا ہے، یہ سب سامراجیوں کا پروپیگنڈا ہے۔ پہلے انہوں نے ترکوں کو زک دینے کے لئے قومیت کا یہی افسوں عربوں اور مصریوں کو پڑھایا اور اب جب اس کی زد خود ان پر پڑی ہے تو یہ اسلامیت کے علم بردار بن گئے ہیں۔ جو لوگ بلا تحقیق اس قسم کی باتیں آج پھیلا رہے ہیں میرے نزدیک وہ اسلام کی نہیں بلکہ بالواسطہ اسرائیل کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔ میں جمال عبدالناصر کی اسلامیت کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ میں ان کو اسی قسم کا مسلمان حکمران سمجھتا ہوں جس قسم کے ہمارے اور آپ کے حکمران ہیں۔ مغربیت جس طرح سب کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ان کی گھٹی میں بھی پڑی ہوئی ہے۔ آمر مزاج ہونے کی وجہ سے ان سے بعض شدید قسم کی غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن یہ بالکل ہی لایعنی بات ہے کہ وہ فرعونی تہذیب کے احیاء کے علمبردار ہیں۔ اگر وہ فرعونی تہذیب کے علمبردار ہیں تو ان سے زیادہ نادان کوئی بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس نعرہ کے ساتھ ان کے اتحاد عرب کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ وہ مذہب کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن اپنی سیاست کے تقاضوں کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں نا، جو شخص عدن سے لے کر الجزائر اور مراکش تک کی وحدت کا خواب دیکھ رہا ہو وہ چاہے موسیٰؑ اور محمدؐ کا نام لے یا نہ لے لیکن فرعون کا نام لے کر اپنے ایک حوصلہ مندانہ خواب کو خواب پریشان بنانے کی حماقت تو بہر حال نہیں کرے گا

ترکوں کے خلاف جب مصر وغیرہ میں نسلی قومیت کی تحریک ابھری تھی تو بلاشبہ اس کا
یہی تھا کہ "مصر مصریوں کیلئے ہے" اور "فراعنہ ہمارے بزرگ ہیں"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قومیت کا
بنانے میں عیسائی ادیبوں اور قبطی مفکروں کو بڑا دخل تھا۔ ان کے لٹریچر اور ان کے افکار سے م
ہوکر نیشنلسٹ قسم کے مسلمان بھی اسی قسم کی بولیاں بولنے لگے تھے لیکن یہ زمانہ ماضی کی باتیں
اس قسم کی باتوں کی ذمہ داری آج جمال عبدالناصر پر ڈالنا ہمارے نزدیک انصاف کے خلاف
شخص سمجھ سکتا ہے کہ آج جمال عبدالناصر قومیت کے اس تنگ تصور کے ساتھ اتحاد عرب
میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سامراجیوں کو پراپگنڈے میں مہارت کی داد دینی پڑ
کہ اسی قومیت کو ایک زمانہ میں ثواب بنا کر انہوں نے ترکوں کا عرب ممالک سے جنازہ اٹھوا د
آج اس کو کفر بنا کر جمال عبدالناصر کی گردن مروا دینے کے درپے ہیں تاکہ اسرائیل کا جو خنجر ا
نے امت محمدؐ کے سینے میں پیوست کیا ہے اس وقت تک پیوست ہی رہے جب تک عرب
کی جان نہ نکل جائے۔ پھر داد دیجیے ان خوش قسمتوں کی خوش قسمتی پر کہ اس پروپگنڈے
تعاون کے لئے ہمارے اندر ہی سے ان کو ہر قسم کے آدمی ہاتھ آ گئے ہیں۔

تصحیح

۱۔ میثاق بابت مئی ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۲۶ پر قرآن مجید کی جو آیات نقل کی گئی ہیں ان میں آیۃ ۱۶۳ وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ لکھنے رہ گئی ہے۔

۲۔ میثاق بابت جون ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۲۷ کی چوتھی سطر میں "سورہ انعام" کے بجائے "نساء" لکھ لیا جائے۔

مقالات

حافظ نذر احمد صاحب

تاریخِ جمع و تدوین قرآن

قرآن مجید کی جمع و تدوین کی تاریخ اس قدر سادہ اور واضح ہے کہ اسے دو جملوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس میں کوئی گنجلک ہے۔ نہ کوئی تحقیق طلب بات ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اللہ رب العزت کا کلام اس کے بندے ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس کا نزول ماہ رمضان میں آج سے ۱۳۹۲ سال بیشتر شروع ہوا تھا۔ حضور اکرمؐ کی عمر مبارک کا اکتالیسواں سال تھا کہ آپ پر غارِ حرا میں کلام پاک کی پہلی وحی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ...... العلق کے الفاظ میں اُتری ـــــ تقریباً ۲۲ سال اور ۳ ماہ کی مدت میں یعنی ہجرت کے تیرہویں سال اس کی تکمیل ہوئی۔ اس کا اعلان اللہ رب العزت نے ان الفاظ میں فرمایا اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ـــــ (المائدہ: ۳) "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کردی اور تم پر اپنی نعمت مکمل کردی اور میں نے تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا۔"

کلام پاک نجماً نجماً نازل ہوا یعنی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں وحی اُتری۔ کبھی ایک آیت کبھی دو چار آیتیں، کبھی مکمل سورت، کبھی کسی سورت کا کوئی حصہ ـــــ جیسے جیسے کلام اللہ نازل ہوتا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فوراً یاد کر لیتے۔ آپ کو اس کی اتنی کاوش تھی کہ اللہ پاک نے فرمایا لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ـــــ (القیامۃ: ۱۶، ۱۷) "اسے پڑھنے کے لئے اپنی زبان تیز نہ چلاکہ تو اسے سیکھ لے۔ اسے جمع کرنا اور

پڑھتا ہمارا ذمہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے صحابہؓ کو زبانی یاد کرا دیتے تھے۔ "اصحاب صفہ" کا شغل علم دین کی تحصیل اور ذکر و فکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ قرآن مجید کو حفظ کرنے کا اجر و ثواب اس قدر بتلایا گیا کہ ہر دور میں امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اندر ہزاروں لاکھوں افراد نے کتاب اللہ کو اوّل سے آخر تک زبانی یاد کیا۔ دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس خصوصیت میں قرآن مجید کے ساتھ شریک نہیں۔ یہ شرف صرف اسی کتاب کو حاصل ہوا کہ وہ اوراق کے سفینوں کے علاوہ انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہوئی۔

اہل عرب کا حافظہ غیر معمولی طور پر بہت مضبوط تھا۔ انہیں اپنی یادداشت پر بجا طور پر ناز تھا۔ تاہم حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید نمازوں میں پڑھتے اور صحابہ کو سناتے۔ خود ہر رمضان میں جبرئیل امینؑ سے دَور فرماتے بلکہ عمر مبارک کے آخری رمضان میں دوبارہ دہرانا ثابت ہے۔

یادداشت کے اس اہتمام کے علاوہ جس قدر کلام پاک نازل ہوتا آپ وہ کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلا کر لکھا دیتے۔ ان اصحاب کو کاتبانِ وحی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان حضرات میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور پر شامل ہیں :-

حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ۔ حضرت زید بن ثابتؓ۔ حضرت زبیر بن عوامؓ۔ حضرت عبداللہ بن ارقمؓ۔ حضرت اُبی بن کعبؓ۔ حضرت عامر بن فہیرہؓ۔ حضرت ثابتؓ بن قیس۔ حضرت حنظلہ بنؓ ربیع۔ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان وغیرہ ـــــ

ان مستقل لکھنے والوں کے علاوہ حضرت عبداللہ بنؓ مسعود، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی بطور خود لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ حضرات عام طور پر کھجور کے پٹھوں، چمڑے کی جھلیوں یا اونٹ کے شانہ کی ہڈیوں سے کاغذ کا کام لیتے تھے۔ بہر صورت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں کلام اللہ منتشر اجزا کی صورت میں ضبط تحریر میں آ گیا۔ گو کسی ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ لیکن متعدد حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا ـــــ اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں، خود کلام اللہ اس پر

شاہد عادل ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (الطور: ۱ و ۲) "قسم ہے طور کی۔ اور کشادہ ورق میں لکھی ہوئی کتاب کی۔"

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (الواقعہ ۷۷ تا ۷۹) "یہ عزت والا قرآن ہے چھپی ہوئی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔"

یہی نہیں بلکہ کلام اللہ کا نام ہی "الکتاب" ہے اور اسی نام سے اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (البقرہ: ۱ و ۲) "اس کتاب میں کوئی شک نہیں" ——

قرآن مجید کا حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مکتوب ہونا کفار کے اس قول سے ثابت ہے۔ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا (فرقان: ۵) "کفار کہتے ہیں یہ تو قصے ہیں پہلے لوگوں کے، جنہیں آپ نے لکھ لیا ہے۔"

اگر کلام اللہ ضبط تحریر میں نہ آگیا ہوتا تو اسے "الکتاب" "کتاب مسطور" اور "کتاب مکنون" کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مختلف اوقات میں نازل ہونے والے حصوں کی ترتیب خود وحی الٰہی کے مطابق ہوئی۔ ارشاد ربانی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اصل مقام پر لکھنے کا حکم دیتے۔ اسی ترتیب سے خود یاد فرماتے اور اسی ترتیب سے حفاظ صحابہ یاد کرتے اور تلاوت کرتے تھے۔ کلام الٰہی کی ترتیب میں کسی انسانی رائے کو دخل نہیں۔ جیسا کہ خود خداوند رب العزت نے فرمایا۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ۔ (القیمہ) "اس کا جمع کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔" دربار نبوی کے جملہ کاتبوں کی تعداد ۴۳ بیان کی گئی ہے۔ یہ ۴۳ صحابہ مختلف چیزیں لکھنے کی خدمات انجام دیتے تھے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید کی ترتیب حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہو چکی تھی اور تمام اجزا مکتوب صورت میں موجود تھے۔ مختلف حصے مختلف اصحاب نے تحریر کئے تھے اور متعدد اصحاب کے پاس موجود تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ کے زمانہ خلافت کی ایک مشہور "جنگ یمامہ" ہے۔ جو مسیلمہ

کذاب کے خلاف ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ستر (۷۰) حفاظ شہید ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ اوّل سے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ خدانخواستہ اگر اسی طرح حفاظ شہید ہوتے گئے تو کلام پاک کے تحفظ کا کیا ہوگا؟ آپ نے انہیں مشورہ دیا کہ پورا کلام اللہ ایک جگہ لکھا لیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ابتدا میں تامل کیا کہ جو کام خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، میں کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن اُمت کی مصلحت کے پیشِ نظر تجویز کو مناسب سمجھ کر آپ راضی ہو گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس خدمت کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو منتخب فرمایا جب حضورِ اکرم مدینہ تشریف لائے تھے اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ لیکن کلام پاک سے اس انصاری بچہ کے عشق کا یہ عالم تھا اور ان کے خداداد حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ سترہ (۱۷) سورتیں حفظ کر چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے اس قدر متأثر اور مسرور ہوئے کہ یہود کی زبان عبرانی سیکھنے پر مامور فرمایا۔ انہوں نے چند ہی ایام میں کامل مہارت پیدا کر لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات لکھنے لگے۔ وہ مستقل کاتبانِ وحی میں سے بھی تھے اور اپنے فن میں کامل تھے۔ مؤرخ مسعودی کے بیان کے مطابق زید بن ثابت عربی اور عبرانی کے علاوہ فارسی۔ یونانی۔ قبطی اور حبشی بھی جانتے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا "تم جوان عاقل آدمی ہو۔ ہم تم میں کوئی الزام عیب نہیں پاتے۔ تم حضور علیہ السلام کے کاتبِ وحی بھی تھے۔ قرآن مجید کو جمع کرو اور لکھ لو" زید بن ثابت حضرت ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے اصرار پر اس خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔ اگرچہ وہ اس کام میں بطورِ خاص ماہر تھے اور حافظ قرآن بھی تھے لیکن ذمہ داری آسان نہ تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا "اگر اس فرض کے بجائے مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی پہاڑ کے منتقل کرنے کا حکم دیا جاتا تو میں اُسے آسان تر سمجھتا"

بہرصورت اعلانِ عام کر دیا گیا کہ جس کے پاس قرآن حکیم کا کوئی جزو ہو وہ اسے پیش کر دے۔ چنانچہ جس کے پاس جو کچھ اور جس صورت میں مکتوب تھا، وہ لے آیا۔ لیکن حافظِ قرآن ہونے کے باوجود حضرت زید بن ثابت کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص سے دو حفاظ کی شہادت لیتے کہ یہ نوشتہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ترجمان سے براہِ راست سن کر لکھا گیا ہے۔

اس کاوش اور احتیاط کے ساتھ الگ الگ صحیفوں میں مکمل کلام پاک کی کتابت ہوئی ۔ اس کام میں مختلف جلیل القدر صحابہؓ نے تعاون کیا ۔ یہ مکمل نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تحویل میں رہا ۔ ان کے بعد ان کے جانشین خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حفاظت میں رہا ۔ ان کے بعد ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ کی تحویل میں آگیا ۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک نئی صورت حال سامنے آئی ۔ اس وقت تک اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا ۔ متعدد غیر عرب اقوام کلمۂ حق قبول کر چکی تھیں ۔ خود عرب کے تمام قبیلے حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے ۔ یہ لوگ کلام پاک کی تلاوت اپنے اپنے لہجہ میں کرتے تھے ۔ متعدد الفاظ کے لہجہ کی تبدیلی سے تلفظ میں بھی تبدیلی ہو رہی تھی مثلاً صراط کو صراط یا صوط اور صراطُ کی تین صورتوں میں پڑھتے ۔ اسی طرح علیہم کو علیھُم بھی پڑھتے طٰہٰ کا تلفظ طہ بھی کرتے تھے ۔ وغیرہ ــــ گو اس وقت تلفظ اور لہجے کی یہ تبدیلی کوئی قباحت نہیں پیدا کر رہی تھی کیوں کہ اس سے معانی و مطالب پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا ۔ تاہم آگے چل کر نا واقفوں کے اندر اس کے برے اثرات اور اختلافات کا شدید خطرہ ہو سکتا تھا ۔

حضرت حذیفہ بن یمان نے آذر بائیجان پر لشکر کشی کے وقت اس اختلاف کو خاص طور پر محسوس کیا ۔ اور واپسی پر خلیفہ ثالث کو اس کی اطلاع دے کر تدارکِ احوال کی طرف متوجہ کیا ۔ آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا ۔ اور فیصلہ کے مطابق ام المؤمنین حضرت حفصہؓ سے مصحف منگایا تاکہ اس سے مزید نقول تیار کرائی جائیں اور امت کو ایک قرأت پر جمع کیا جائے ۔

اس مرتبہ پھر اس عظیم خدمت کے لئے نگہ انتخاب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر ہی پڑی ان کی سرکردگی میں نقول تیار کی گئیں یہ واقعہ ۲۵ھ کا ہے شریک کار صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ عبد اللہ بن عباسؓ ۔ عبد اللہ بن حارث ۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ ابی بن کعب اور حضرت عبد الرحمٰن بن ہشامؓ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ اب نامکمل تحریریں اور منتشر اجزا تلف کر دیئے گئے اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لہجے اور تلفظ میں یکسانیت پیدا ہو گئی اور قرأت کا اختلاف ختم ہو گیا ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو چار نقول تیار ہوئیں انہیں جامع الصحف اور "مصاحف الائمہ" کہا جاتا تھا ۔ یہ نسخے مفتوحہ علاقوں میں بھیج دیئے گئے ۔ تاکہ جو شخص چاہے ان

مستند مصاحف سے نقول تیار کرے۔ اور ہر کوئی تلفظ قرأت میں قریش کے تلفظ کی پیروی کرے۔ ایک نسخہ کوفہ۔ دوسرا بصرہ۔ تیسرا شام بھیجا گیا۔ اور چوتھا خود اُن کے پاس رہا۔ مزید تین نسخوں کا ذکر بھی آتا ہے جو کہ یمن۔ اور بحرین بھیجے گئے۔

اس کارنامہ کی بنا پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جامع القرآنؓ کہا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی ایک قرأت پر امت کو جمع کرنے والے۔ جامع القرآن سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ انہوں نے کتاب اللہ کی ترتیب وتدوین کی ہے یا کلام اللہ کو جمع کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ کام تو خود حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تنزیل کے ساتھ ساتھ ہو چکا تھا۔

اس وقت تک قرآن مجید میں اعراب (زیر زبر) اور نقطوں کا رواج نہ تھا۔ اعراب کی جگہ بھی کچھ نقطے ہی لگاتے تھے۔ البتہ اُن کے لئے رنگ مختلف استعمال کئے جاتے تھے۔ دراصل عربوں کو اہل زبان ہونے کے اعتبار سے ان سہولتوں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن جوں جوں اسلام غیر عرب اقوام میں پھیلتا گیا ان امور کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔

اموی دور میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کو اس ضرورت کا احساس ہوا چنانچہ عراق کے مشہور گورنر حجاج بن یوسف (متوفی ۹۵ھ) نے قرآن مجید میں اعراب اور نقطے لگوائے۔ اور آیات وغیرہ کے رموز واوقاف بھی لگوائے۔ یہ خدمت دو مشہور علماء حسن بصریؒ۔ اور یحییٰ بن یعمر نے انجام دی۔ اس سے غیر عرب لوگوں کے لئے تلاوت اور معانی کے سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی ــــ اعراب کو آخری شکل خلیل بن احمد نے دی۔ یہ بزرگ عباسی عہد کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ الحمدللہ آج تک کلام پاک اسی ایک صورت میں پڑھا جاتا ہے اور دنیا بھر کے نسخوں میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ سب "مصحف عثمانیؓ" کے مطابق ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر احسان ہے کہ خود عہد عثمانی کے مصحف آجتک دنیا میں محفوظ اور موجود ہیں ۹ر فروری ۱۹۶۱ء کو اس لاہور شہر میں سفیر روس متعینہ پاکستان ڈاکٹر ایم ایس کپتسانے اپنے بیان میں بتلایا تھا کہ تاشقند میں کلام پاک کا وہ نسخہ موجود ہے جو اپنی شہادت کے وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تلاوت فرما رہے تھے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اپنے دورۂ روس

یں یہ نسخہ دیکھ چکے ہیں۔ سفیر روس نے مزید اعلان کیا تھا کہ عنقریب پاکستان کو اس تاریخی نسخہ کی ایک
فوٹو کاپی مہیا کر دی جائے گی (راپ ، فروری ۱۹۶۱ء)۔

یہ فقرہ اکثر بزرگوں سے آپ نے سنا ہوگا کہ گذشتہ چودہ صدیوں میں قرآن مجید کا ایک شوشہ
تک نہیں بدلا - یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اور اگر قرآن کی کتابت کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے
تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کتابت بھی ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

مثالاً عرض کرتا ہوں قرآن مجید میں ایک لفظ دس جگہ آیا ہے۔ آٹھ مقامات پر وہ ایک انداز
میں لکھا ہوا ہے لیکن دو مقامات پر اس کو مختلف ہجاسے لکھا گیا ہے۔ اور دنیا بھر کے ہر نسخے میں
اسی انداز سے کتابت ہو رہا ہے۔ حالانکہ بظاہر اس دوسرے طریق کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن قرآن مجید
کا ہر کاتب آج بھی چودہ سو سال پہلے کے کاتب اول کی تقلید کرتا ہے۔ کیا مجال کہ کروڑوں نسخوں میں
سے کسی ایک نسخہ میں بھی اس جگہ شوشہ بدل جائے۔

امثلہ طاغین .... طٰغین ملإیھم .. .. .. ملئھم
المشارق .. .. المشٰرق ضلال .. .. .. ضلٰل
صٰفّت .. .. .. صافات العلماء .. .. .. العلمٰوء
لاأذبحنه .. .. .. لاأذبحنہ

کلام اللہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے مسلمانوں کے والہانہ عشق کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا
جا سکتا ہے۔ کہ اسے صحیح طور پر پڑھنے اور عربوں کے لب و لہجہ کے مطابق تلاوت کرنے کے
لئے تجوید و قرأت کے ایک مستقل فن کی بنیاد ڈالی گئی اس علم پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس مقصد وحید کے
لئے ہر دور میں لوگوں نے اپنی زندگیاں وقف کیں اور مستقل مکاتب و مدارس قائم کئے۔

قرأت ایک مستقل فن ہے۔ لب و لہجہ اور تلفظ کے اعتبار سے اس کے سات مستقل انداز
ہیں جنہیں "سبعہ قرأۃ" کہا جاتا ہے۔ ہر قرأت ایک امام سے منسوب ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ
ہیں:-

۱۔ حضرت امام نافع مدنی رح (متوفی ۱۶۹ھ) مدینہ منورہ

۲- حضرت امام عبد اللہ بن کثیر مکیؒ (متوفی ۱۲۰ھ) مکہ مکرمہ
۳- امام ابو عمرو بن علا بصریؒ (متوفی ۱۵۴ھ) کوفہ
۴- امام عبد اللہ بن عامر شامیؒ (متوفی ۱۱۸ھ) دمشق
۵- امام عاصم کوفیؒ (متوفی ۱۲۷ھ) کوفہ
۶- امام حمزہ بن حبیب کوفیؒ (متوفی ۱۲۶ھ) حلوان
۷- امام کسائی کوفیؒ (متوفی ۱۸۹ھ) رے

ان مشہور سات آئمہ قرأت کے علاوہ تین اور امام ہوئے ہیں - یعنی

۸- ابو جعفر یزید مدنیؒ
۹- یعقوب الحضرمی - بصرہ
۱۰- خلف بن ہشام بزار کوفی

اس طرح قرآن کریم کی تلاوت کی عشر قرأ یعنی دس طریق تجوید ہوئے -
آجکل بالعموم ہم سیدنا حفصؒ کی قرأت کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے ہیں - آپ نے ۱۸۰ھ یا ۱۹۰ھ وفات پائی - آپنے قرأت کے پانچویں امام عاصم کوفیؒ سے روایت کی ہے ان سب ائمہ کے شیوخ واساتذہ کے اسمائے گرامی - ان کے راویوں کے اسماء وحالات کتب تاریخ وسیر میں محفوظ ہیں - ان کی قرأت کے انداز اور مابہ الامتیاز امور کامل طور پر مسطور و مرقوم ہیں - عربی کے علاوہ خود اردو زبان میں اس فن پر درجنوں کتابیں موجود ہیں ___

اقتباسات وتراجم

جناب خالد مسعود صاحب

سیاستِ نبویؐ کا ایک اہم پہلو

رمضان ۹ھ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس لوٹ چکے تھے۔ تبوک کا غزوہ وہ تھا جس میں مسلمان روم کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے اور یہ سفر اس زمانہ میں پیش آیا جب گرمی زوروں پر تھی اور ملک میں فصل کا زمانہ ہونے کی وجہ سے پھل پک چکے تھے۔ یوں تو حضورؐ کی عادت مبارک یہ تھی کہ دشمن کو زک پہنچانے اور لڑائی کی مہم کو کامیاب بنانے کے نقطہ نظر سے اسکی سمت اور اسکے علاقہ کو مخفی رکھنے کیلئے آپؐ غزوات کے ارادہ کو راز میں رکھتے لیکن اس غزوہ کے موقع پر آپؐ نے تبوک جانے کا اعلان فرما دیا۔ اس کے بارے میں ابنِ ہشام لکھتا ہے :-

"سوائے غزوۂ تبوک کے کہ اس میں آپؐ نے طویل مسافت، موسم کی شدت اور مقابل دشمن کی کثرت کا لحاظ رکھتے ہوئے لوگوں میں اس کا عام اعلان فرما دیا تاکہ لوگ اس کے لئے ضروری سامان ساتھ لے لیں۔ پھر آپؐ نے تیاری کا حکم دیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ آپ رُوم کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فاتح لشکر کے ساتھ واپس لوٹے جسے اللہ تعالیٰ کی شدید آزمائش نے ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر کے منافقوں اور کمزور ایمان والوں کو چھانٹ دیا تھا۔ سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات ان لوگوں کے نفاق، تردد اور کمزوری ایمان کا ایک ابدی نشان بن گئی ہیں :

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	نہیں رخصت چاہتے تجھ سے وہ لوگ جو
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا	اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اپنے مال

بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ - وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظّٰلِمِينَ

(توبہ ۴۴-۴۷)

اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کی - اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے - تجھ سے رخصت تو وہی لوگ چاہتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک میں ڈھلمل یقین ہو رہے ہیں - اگر وہ واقعی نکلنا چاہتے تو اس کی تیاری کرتے مگر خدا نے انہیں اٹھانا پسند نہیں کیا، پس اس نے انہیں روک دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو اگر وہ نکلتے تو تمہارے اندر فساد بڑھاتے اور تمہارے درمیان فتنہ پھیلانے کی کوشش کرتے - اور تمہارے اندر انکے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے -

جب حضورؐ ذی اوان میں تھے تو آپ کو خبر پہنچی کہ منافقین کے ایک گروہ نے مومنین کی جماعت میں تفریق ڈالنے کی غرض سے ایک مسجد تعمیر کی ہے - یہ وہ مسجد تھی جس میں حضورؐ کی تبوک کو روانگی سے قبل منافقوں نے حضورؐ سے نماز ادا کرنے کی درخواست کی تھی اور تعمیر مسجد کا مقصد یہ بتایا تھا کہ "ہم نے اسے مریضوں، حاجتمندوں اور سردی کی بارانی راتوں کے نمازیوں کی خاطر تعمیر کیا ہے"۔ اس وقت حضورؐ نے اپنا جواب غزوہ تبوک سے واپسی تک ملتوی فرمایا تھا۔

جب آپؐ کو ذی اوان میں یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو بلا کر حکم دیا کہ ظالموں کی اس مسجد کو جا کر گرا دو اور اسے آگ لگا دو - وہ دونوں جلدی سے گئے اور مسجد کو گرا کر آگ لگا دی - اسی مسجد اور اس کے تعمیر کنندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا

اور جنہوں نے مسجد بنائی ضرر پہنچانے کے لئے

ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ (توبہ ۱۰۷)

اور کفر کے لئے اور مومنین کے درمیان تفریق ڈالنے کے لئے اور اس شخص کو گھات مہیا کرنے کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑا اور یہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

اس طریقہ سے نبی قائد نے وحدت جماعت کیلئے خطرہ بنے ہوئے نفاق کی سرزنش کے لئے مضبوط قدم اٹھانے کا حکم دیا اور اسے مسلمانوں کے لئے عبرت کا نمونہ قرار دے کر یہ سبق دیا کہ مومنین کے دشمنوں کا مسجدیں بنانا اور مظاہر اسلام کو اختیار کرنا نبیؐ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں پاسکا بلکہ اس کا غضب ان کے مظاہر اسلام کے اختیار کرنے کی نسبت ہی سے زیادہ ہوا اور نبیؐ نے ان مظاہر کی بیخ کنی میں بھی پوری درشتی سے کام لیا۔ قرآن کریم نے بھی منافقین کی قسموں کو جھٹلا کر ان کی خباثت کو نمایاں کیا ہے۔ فرمایا

وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ (توبہ ۱۰۷)

اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں:۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد قبائل طائف کا نمائندہ وفد ثقیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت اور قبول اسلام کی غرض سے آیا۔ ان کی شرط یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مطالبات منظور فرمائیں اور ان کی قوم، ان کے علاقوں اور اموال کے بارے میں انہیں خصوصی پروانہ لکھ کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ملاقات کی اور ان کی شرائط سنیں۔ ان میں ایک شرط ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ تھی کہ "ان کے قبیلے کے بت "لات" کو ان کے لئے باقی رہنے دیا جائے اور تین سال کی مدت تک اسے نہ گرایا جائے"۔

وفد ثقیف کی دلیل یہ تھی کہ جب تک ان کی قوم اسلام نہیں لے آتی، وہ اس کے بت کو توڑ کر اسے دہشت میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ اس مدت کو سالوں سے گھٹاتے گھٹاتے ایک ماہ تک لے آئے

لیکن حضور نے دو ٹوک فرما دیا کہ آپ ہدم لات کے لئے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کو تیار نہیں خواہ یہ مدت ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد وفد ثقیف نے درخواست کی کہ انہیں نماز معاف کر دی جائے اور ان پر یہ پابندی نہ لگائی جائے کہ وہ اپنے بتوں کو اپنے ہی ہاتھوں توڑیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا! "جہاں تک اپنے ہاتھوں بتوں کے توڑنے کا تعلق ہے، ہم تمہیں اس کی معافی دیں گے لیکن جہاں تک نماز کی معافی کا تعلق ہے، یاد رکھو کہ جس دین میں نماز نہیں اس دین میں کوئی خیر نہیں" پھر آپ نے حضرت ابوسفیان بن حربؓ اور مغیرہ بن شعبہ کو طائف بھیجا انہوں نے وہاں جا کر لات کو توڑا۔ پھر حضورؐ نے حضرت عثمان بن ابوالعاصؓ کو ان کی صغرسنی کے باوجود صرف اس لئے ثقیف کا امیر مقرر کر دیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ "یا رسول اللہ! میں نے ان لوگوں میں سے اس لڑکے کو اسلام کے سمجھنے اور قرآن سیکھنے میں سب سے زیادہ حریص پایا ہے"

اس واقعہ میں ہم دوسری مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست میں مضبوط فیصلہ کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ ایک معبودٌ مِنْ دُونِ اللہ کی بیخ کنی میں تاخیر کی اجازت نہ دے کر دوسرے فرض نماز کا حکم دینے میں۔ پھر عثمان بن ابوالعاص کو ان کی صغرسنی کے باوجود محض ان کے تعلیم قرآن اور تفقہ فی الاسلام کے شوق کے پیش نظر ثقیف کا امیر مقرر کر دینے میں بھی ہمیں حضور کا حتمی فیصلہ نظر آتا ہے جو آپ نے ایک نبی کے مخصوص معیارِ انتخاب پر انہیں جانچ کر کیا۔

ہمارے اہل سیاست جب سیرت النبیؐ کے اس پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں خیال ہوتا ہے کہ ہدم لات میں ذرا سی تاخیر گوارا کر لینے میں آخر کیا ہرج تھا، جب کہ ایک نہ ایک دن اسے منہدم ہونا ہی تھا؟ اگر یہ تاخیر گوارا کر لی جاتی تو اہلِ طائف کے جذبات اور زیادہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے۔ اسی طرح اگر کچھ عرصہ کے لئے نماز معاف کر دی جاتی تو اس سے کیا نقصان ہوتا جبکہ ان لوگوں میں اسلام ابھی نیا نیا داخل ہو رہا تھا؟ امیر کے تقرر میں بھی ہمارے ان اہل سیاست کو ایک چیلنج نظر آتا ہے جو وفد ثقیف کے مسلمہ معیارِ سیادت کو دیا گیا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبی کی سیاست اس طرح کی حکمت عملیوں پر مبنی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسے زندہ اور واضح عقیدہ سے پھوٹتی ہے جو حق کے معاملہ میں نمائشی رواداری سے کام نہیں لیتا۔ یہ اس واضح اور کامل پیغام پر مبنی ہوتی ہے جس کے اٹھانے کے اہل صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دلوں میں اس کی جڑیں اچھی طرح راسخ ہو چکی ہوں اور وہ اس کے معاملہ میں کبھی متزلزل نہ ہوں۔ جب معاملہ عقیدہ توحید کا ہوتا ہے اور یہ حقیقت پیش نظر ہوتی ہے کہ یہ عقیدہ خدا کے ساتھ کسی بُت کی پرستش اور کسی طاغوت کے خوف سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا تو آپ کو نبی کی سیاست میں بناوٹ اور رواداری کی تعبیروں کا سراغ نہیں ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے داعی کسی نرمی یا رخصت پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم نے اسی واقعہ میں دیکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد ثقیف کو اتنی رعایت دی کہ خود ان کے اپنے ہاتھوں بُت کو نہیں تڑوایا۔ ان کو نرمی سے حقیقت سمجھائی حتیٰ کہ انہوں نے حضورؐ کی بات مان لی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح رہے کہ اگرچہ حضورؐ نے ان کے ساتھ نرمی بھی کی اور انہیں رعایت بھی دی لیکن جہاں تک بتوں کے توڑنے اور اس میں تاخیر نہ کرنے کا تعلق ہے آپؐ اپنے عزم پر قائم رہے اور اس کو قربان نہیں ہونے دیا۔

(المسلمون)
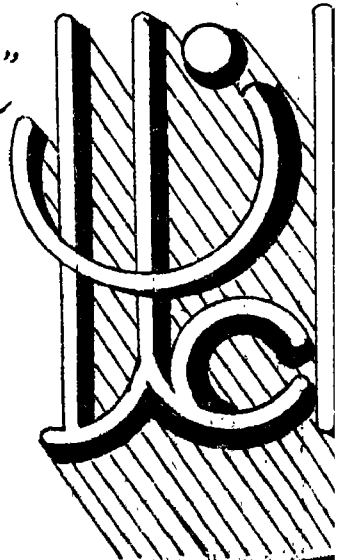
بقیہ مضمون صفحہ ۸ سے آگے

"تذکرہ و تبصرہ"

اس وجہ سے کسی باایمان سنی کے لئے ان کی کسی قسم کی توہین برداشت کرسکنا ناممکن ہے اور اس معاملہ میں کسی قسم کی رواداری برتنا کفر و نفاق ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر شیعہ سُنی فسادات کے سدباب کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ان بزرگوں کی توہین کے تمام امکانات کا حتمی طور پر سدباب کردیا جائے۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے اس مطالبہ کا تعلق حضرات شیعہ کی نجی مجالس و محافل سے نہیں ہے۔ وہ اپنی نجی مجالس میں جو چاہیں کریں اور کہیں لیکن پبلک میں اس قسم کی کسی حرکت کی گنجائش کسی کے لئے بھی نہیں ہونی چاہیئے۔

یہ ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے یہی جذبات حضرت علیؓ حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور تمام اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اجمعین کے لئے بھی ہیں۔ ان کی محبت بھی ہمارے لئے جزوِ ایمان ہے۔ ہم ان کی محبت کے غیر مشروط طور پر پابند ہیں۔ شیعہ حضرات کا رویہ حضرات شیخینؓ اور دوسرے صحابہؓ کے معاملہ میں خواہ کچھ ہی رہے ہمارا رویہ اہل بیت رسالتؐ کے معاملہ میں کبھی بدل نہیں سکتا۔ اگر ہمارے سینے انکی محبت سے خالی ہوجائیں تو یہ ایمان سے خالی ہوجاتا ہوگا۔ ہر سُنی اس معاملہ کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا ہے اس وجہ سے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی اشتعال انگیز سے اشتعال انگیز موقع پر بھی کوئی سنی اہل بیت اطہار کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہہ سکے۔ کہہ سکنا تو درکنار اس کا تصور بھی کرسکے۔ خلوت ہو یا جلوت۔

ہمارے نزدیک اصل بنیادی مسئلہ یہی ہے جس کا حل سوچنا ہے۔ اور یہ کام اب حکومت ہی کے کرنے کا ہے۔ عملاً اس کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں یا کرنی چاہئیں اس بارے میں ہم اپنی طرف سے کوئی مشورہ دینا نہیں چاہتے۔ اس سلسلہ میں بعض مفید اور معقول تجویزیں اخبارات میں آئی ہیں وہ حکومت کے علم میں ہیں۔ حکومت اگر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہے گی تو ان تجاویز سے بھی فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ اور ان کے علاوہ بھی بعض مؤثر شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

تقریظ و تنقید
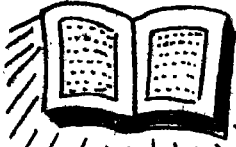
تالیف : مولانا عبدالباری ندوی سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی
ضخامت : ۲۸۷ صفحات　قیمت　ساڑھے تین روپے
ناشر : ادارہ مجلس علمی، پوسٹ بکس نمبر ۴۸۸۳ کراچی

اس کتاب کے مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں - آپ اپنے علمی و دینی مشاغل ور غلوص وللّٰہیت کی بنا پر ملک کے اہلِ علم میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں - آپ کی تصنیف نظام صلاح و اصلاح" آپ کی بزرگانہ نصیحت اور فیض رسانی کا ایک مظہر ہے -

یہ کتاب بظاہر تو سورۃ العصر کی تفسیر کے طور پر لکھی گئی ہے لیکن مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں اس کتاب کے ذریعہ مصنف محترم نے مسلمانوں کا حق نصیحت ادا یا ہے - ان کے پیشِ نظر" خیر امت "کے عظیم منصب کے تقاضے بھی ہیں اور ملت کی تہی دامنی ور ماندگی کا احساس بھی - انہیں اپنے امراء، عوام اور علماء و مشائخ سب کے اندر سے ابراہیمی روح مفقود ہوتی نظر آتی ہے اور جو چیدہ ہستیاں اپنے فرائض ادا کر رہی ہیں ان کے وجود کو وہ دین کے تقاضوں کے اعتبار سے بالکل ناکافی سمجھتے ہیں - اس صورت حال کے پیش نظر فاضل مصنف نے قوم کو بیدار کرنے کی قابل تحسین کوشش کی ہے -

اس طرح کے موضوع پر عموماً جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں لوگ قوم کی بے حسی اور معاشرتی قدار کی تبدیلی کا رونا رونے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن زیر نظر کتاب ایسی نہیں ہے - اس میں محترم مصنف نے قوم کی بے حسی کا تجزیہ کیا ہے اس کے اسباب کا کھوج لگایا ہے اور اس کو ختم کرنے اور مسلمانوں میں معروف و منکر کا شعور بیدار کرنے کے لئے قابلِ عمل تجاویز پیش کی ہیں -

اس سلسلہ میں مصنف محترم نے ان دینی جماعتوں کا بھی جائزہ لیا ہے جو قوم کی اصلاح کیلئے ملک میں گرم عمل ہیں۔ اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مصنف جس چیز کو سب سے زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں وہ ایک مستحکم مثالی معاشرہ کا قیام ہے۔ ان کے نزدیک ایسے معاشرہ کے قیام کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں موجود نہیں ہیں۔ ضرورت جس امر کی ہے وہ یہ ہے کہ علماء کا طبقہ اس کے لئے جدوجہد کرے اور ایک ایک گھر کی ہمہ گیر اصلاح کو مقصد بنایا جائے۔ یہ گھر ملو اصلاح خواہ ایک مختصر سے خطے ہی سے شروع ہو لیکن اسے کماً وکیفاً معقول حد تک ہونا چاہیئے۔

ہم محترم مصنف کے نتائج فکر سے اتفاق رکھتے ہیں ہمارے نزدیک بھی ملت کی اصلاح کا فطری راستہ یہی ہے کہ فرد واحد کی اصلاح کے نتیجہ میں صالح معاشرہ پیدا کیا جائے۔ اور ایسے علماء پیدا کئے جائیں جو موجودہ دور کے تقاضوں اور نئے مسائل کو سمجھتے ہوئے دعوت دین کا یہ کام سر انجام دے سکیں۔ یہ جدوجہد جب تک ہر پہلو سے متوازن نہ ہو گی اس وقت تک اس سے صالح نتائج پیدا نہ ہو سکیں گے۔

ہم قارئین سے اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے اندر اقامت دین کا ولولہ پیدا کرنے کا باعث ہو گی۔

کتاب مجلد ہے اور سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

(خ۔م)

[illegible] پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق [illegible]

Monthly "MEESAAQ" Lah...
JULY 1963

گست ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت [illegible]

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۹ | ربیع الاول ۱۳۸۳ ہجری | شمارہ ۲

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
مینیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ — اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر
مینیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"
باغ گونگے نواب — لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اسلامی مشاورتی کونسل کا معاملہ شروع ہی سے کچھ عجیب و غریب سا رہا ہے۔ اوّل تو اس کے لئے جو اشخاص منتخب کئے گئے ان کے ناموں ہی کو سن کر اس کے مستقبل سے متعلق نہایت شدید قسم کی مایوسی ہوگئی تھی ثانیاً اس پر جو پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں وہ ایسی غیر منطقی تھیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اگر یہ کونسل کوئی کام کرنا بھی چاہے گی تو کس طرح کر سکے گی۔ چنانچہ اب یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ اپنے روز پیدائش سے لے آج تک کی وسیع مدت میں یہ کونسل مجالس قانون ساز کو کوئی ایک مشورہ بھی دینے کے قابل نہ ہو سکی۔ حالانکہ قومی خزانے کا ہزاروں لاکھوں روپیہ اس پر صرف ہو چکا ہوگا۔

حکومت کے ذمہ داروں کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے ایک سے زیادہ معاملات میں کونسل کا فتویٰ معلوم کرنا چاہا لیکن اس کی طرف سے ہمیں کوئی جواب ہی نہیں موصول ہوا۔ کونسل کے ذمہ داروں کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اوپر بعض ایسی پابندیاں عائد ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم کسی معاملہ میں جلدی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ مثلاً یہ کہ وہ اس بات کے پابند ہیں کہ جب ان کے سامنے حکومت کی طرف سے کوئی استفتا آئے تو وہ اس سے متعلق ضروری معلومات و حقایق فراہم کر لے کی درخواست اس اسلامی ریسرچ کے ادارے سے کریں جو حکومت کے زیر اہتمام قائم ہے جب وہ ضروری معلومات و حقایق فراہم کر کے دے تب

کونسل اس کی روشنی میں رائے قائم کرے اور اپنی اس رائے سے متعلقہ اداروں کو آگاہ کرے۔ کونسل کو شکوہ ہے کہ اب تک اس ادارے سے جن معاملات میں معلومات و حقایق فراہم کرنے کی خواہش کی گئی ادارے نے اس کی تعمیل ہی نہیں کی اس وجہ سے کونسل اس قابل نہیں ہو سکی کہ کسی استفتے کا جواب لکھ سکے۔

جب صورت حال یہ ہے تو ہمارے نزدیک حکومت بھی مجبور ہے اور کونسل بھی۔ حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ اس غریب کو کیا خبر کہ کیا چیز اسلامی ہے اور کیا چیز غیر اسلامی، وہ تو کوئی رہنمائی حاصل کر سکتی ہے تو اسلامی کونسل ہی سے حاصل کر سکتی ہے، جب کونسل اس کو کوئی رہنمائی ہی نہ دے تو آخر وہ کیا کرے اور مجالس قانون ساز کے سامنے کیا چیز پیش کرے!!

رہی کونسل تو اس کی بے بسی بھی واضح ہے۔ جب اس کی محفل آرائی کے لئے وہ روغن تیل ضروری ہو جو اسلامی ریسرچ کے کولہو سے نکلا ہوا ہو تو آخر وہ اس کی فراہمی کے بغیر ہی کس طرح تمام روایات و آداب کو توڑ کر بے نقاب و بے حجاب ہو جائے!

اس سلسلہ میں ہمیں اسلامی ریسرچ کے ادارے کا عذر اگرچہ معلوم نہیں ہو سکا ہے لیکن ہم یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی اگر کوئی تساہل ہو رہا ہو گا تو بے سبب نہیں ہو رہا ہو گا۔ عجب نہیں کہ اس کی ٹانگ بھی کسی اور ادارے کے ساتھ باندھ دی گئی ہو اور وہ اس الجھن میں پھنس کر کونسل کے جوابات لکھنے کی فرصت نہ پا رہا ہو۔

افسوس ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار اگر اسلام کے نام پر کوئی کام عوام کو بہلانے کے لئے کرتے بھی ہیں تو اس کو بھی خوبصورتی کے ساتھ نباہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہر شخص روز اول سے جانتا ہے کہ اس اسلامی کونسل کے ہاتھوں نہ اسلام کا کچھ بننا تھا نہ کچھ بگڑنا بلکہ یہ محض اسلام اسلام پکارنے والے عوام کا جی خوش کر دینے کی ایک تدبیر تھی۔ حکومت کا فائدہ ہی تھا اگر اس کا کچھ بھرم قائم رکھنے ہی کی کوشش کی گئی ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے کار فرما حضرات یہ بھی نہ کر سکے۔ اسی کونسل کا نام لے کر دستور کی اسلامیت کے گن گائے جاتے تھے اور اسی کے بل پر ہمارے صدر ریاست عوام کو اطمینان دلاتے تھے کہ دستور میں اسلام کی حفاظت کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔ اب وہی فرمائیں کہ جب حالات یہ ہیں جو ہم کو بتائے

تو اس کی اطمینان بخشی کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے۔

(۲)

عائلی قوانین جس بے تدبیری اور جلد بازی سے قوم پر مسلط کئے گئے تھے اس سے یہ اندیشہ شروع ہی میں پیدا ہوگیا تھا کہ اس کے نتائج نہایت پیچیدہ صورت میں برآمد ہوں گے۔ چنانچہ اب یہ عملی شکل میں سامنے آگئے ہیں جمہور کی طرف سے پوری شدت کے ساتھ اس کی منسوخی کا مطالبہ ہے لیکن حکومت نے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبر حضرات اس کو آئندہ کے انتخاب کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں، مغربی تہذیب کے دلدادگان، خواتین اور رجال دونوں ہی، اس کو اپنے لئے آزادی کا ایک چارٹر سمجھ رہے ہیں اور اسی پہلو سے اس کی حمایت میں لڑنے اور مرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں، علماء کا طبقہ اس کو مداخلت فی الدین قرار دے چکا ہے اور اس کے نتیجہ میں اب قدرتی طور پر حکومت اور مغرب پسند طبقہ دونوں نے اس کو اپنا حریف قرار دے لیا ہے اور یہ کشمکش اب ایسی شکل اختیار کر چکی ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کی توقع بہت کم ہے اور اگر فتح و شکست سے اس کا فیصلہ ہوا تو فتح خواہ کسی کی بھی ہو، اس سے کسی بہتر نتیجے کی توقع نہیں ہو سکتی۔

اس کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح ہمارے ملک میں اسلام پسند اور مغرب پسند دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف بن کر اُٹھ کھڑے ہوں گے اور ہر محاذ پر ان کے درمیان ایسی کشمکش برپا ہو جائے گی کہ کسی مشترک نقطۂ نظر پر ان کا مجتمع ہونا ناممکن ہو جائیگا اگرچہ ہمارے ملک میں یہ دونوں طبقات پہلے سے موجود ہیں اور ان کے درمیان نظریاتی اختلافات بھی ہیں لیکن ابھی اس اختلاف نے ہار جیت کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا اس وجہ سے سمجھنے اور سمجھانے کے امکانات موجود تھے لیکن اب یہ اندیشہ ہے کہ ایک مرتبہ اگر یہ ہار جیت کی جنگ لڑ کر ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے تو پھر ان کے ملنے کے تمام امکانات ناپید ہو جائیں گے، پھر ان کے اختلافات کا فیصلہ فتح و شکست کے میدان ہی میں ہوگا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کشمکش میں آخری بازی کس کے ہاتھ رہے گی۔

ہمارے علماء کو معاملہ کے اس پہلو پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے اس لئے کہ اسی پر اس ملک

میں دین کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان کو اپنے وقار سے زیادہ دین کو پیش نظر رکھنا ہے۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فریق بن کر لوگوں کے سامنے آئیں، داعی اور مصلح کی حیثیت سے آئیں۔ یہی ان کا اصلی مقام ہے اور اسی مقام پر جمے رہ کر وہ مغربیت کی اس یلغار کا مقابلہ کر سکیں گے جس سے اب وہ عملاً دوچار ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مصر، ترکی، ایران ہر جگہ یہ کشمکش برپا ہو کر ایک نتیجہ تک پہنچ چکی ہے۔ ہم اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ہاں یہ جنگ سب کے بعد چھڑی ہے۔ اس وجہ سے ہم حالات سے نتائج اخذ کرنے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں دوسروں سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس موقع پر ہمارے علماء اور حامیانِ دین کو صحیح قدم اُٹھانے کی توفیق دے اور ان رجحانات سے ان کو محفوظ رکھے جو گمراہی کا باعث ہوئے۔

(۳)

حلقہ تدبر قرآن کا کام مختلف الجھنوں کے باوجود خدا کے فضل و کرم سے بڑی پابندی اور گرمی کے ساتھ جاری ہے۔ جو رفقاء اس میں شریک ہوئے تھے ان کی اکثریت التزام کے ساتھ اسباق میں حاضر ہوتی ہے اور پورا پورا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ ان میں بالخصوص کچھ طالب علم ایسے ہیں جن کی ترقی نے خود مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے اور میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے اس عاجز بندے کو اپنے دین کی ایک حقیر خدمت کی توفیق بخشی اور ساتھ ہی اس محرومی پر حسرت ہے کہ یہ کام میں بہت پہلے کیوں نہ شروع کر سکا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج بہت سے ذی صلاحیت و ذی علم نوجوان اسلام کی مدافعت میں لڑنے کے لئے میدان عمل میں موجود ہوتے۔

اپنی اس خواہش کا اظہار میثاق کی کسی پچھلی اشاعت میں کر چکا ہوں کہ میں اس حلقہ کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دینا چاہتا ہوں۔ اس راہ میں سب سے بڑی مشکل جو اب تک تجربے میں آئی وہ یہ تھی کہ ایسے لوگ نہایت کمیاب بلکہ نایاب ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے لوگوں کو سہل اور مختصر طریقوں سے عربی زبان سکھا سکیں اور قرآن و حدیث کی تعلیم میں وہ راہ اختیار کر سکیں جو جدید تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی ذہنی الجھنیں دور کر سکے۔ اس مشکل کے پیش نظر میں نے اپنی ساری توجہ اس امر پر مرکوز کر دی ہے کہ پہلے اس مقصد کے لئے موزوں

اشخاص تیار کئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس کوشش میں جیسا کہ اُوپر اشارہ کرچکا ہوں،
مجھے میری توقعات سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ بعض رفقاء نے نحو و ادب میں اتنی ترقی کر لی
ہے کہ اب وہ اپنے نئے یا کمزور ساتھیوں کی تعلیم و تربیت میں بڑے سلیقہ کے ساتھ میرا ہاتھ بٹا
رہے ہیں اور ان کا کام میرے نزدیک پوری طرح قابلِ اطمینان ہے۔ اسی طرح اس حلقہ میں
بعض ایسے رفقا بھی ہیں جو ان شاء اللہ بہت جلدی قرآن و حدیث کی تعلیم اور فکری و عملی تربیت
کے کاموں میں بھی میرا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جائیں گے۔

اب میری دلی آرزو یہ ہے کہ یہ حلقہ ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کرلے جو برابر
کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کی خدمت کو تسلسل کے ساتھ
جاری رکھ سکے اور اس کی کوشش سے ہماری قوم کو دین کے ایسے خدمت گزار مل سکیں جو ایک
طرف جدید تعلیم سے آراستہ ہوں اور دوسری طرف دین میں پوری بصیرت رکھنے والے ہوں۔
تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ سب سے عزیز آرزو ہے جو میرے ذہن و دماغ پر اس
وقت حاوی ہے اور میں جس کے لئے اپنے رب سے شب و روز دعا کر رہا ہوں کہ وہ اپنے فضل
خاص سے اس کے اسباب و وسائل فراہم فرما دے۔ اس مقصد کے لئے فی الحال دو چیزوں
کی فوری ضرورت ہے۔

اوّل ایک موزوں مکان کی جو اتنی وسعت رکھنے والا ہو کہ اس میں تربیت گاہ، کتبخانہ
اور باہر سے آنے والے طلبہ کے قیام کے لئے گنجائش نکل سکے۔

دوسری قرآن، حدیث، فقہ، ادب اور تاریخ سے متعلق ان مرکزی کتابوں کی جو تحقیق و
ریسرچ کے کاموں کے لئے ناگزیر ہیں۔

میرے پاس اگرچہ ذاتی کتابوں کا کچھ زیادہ ذخیرہ نہیں ہے تاہم میں یہ ارادہ رکھتا ہوں
کہ اگر اس ادارے کے قیام کی کوئی شکل اللہ تعالیٰ پیدا کر دے تو میں اپنی کتابیں اپنے مسودات
سمیت اس ادارے کی نذر کر دوں گا۔ بعض رفقاء اپنی ذاتی ضرورت کے لئے بھی کتابیں
خرید رہے ہیں۔ حال میں ہمارے ایک رفیق عزیز نے ایک خطیر رقم خرچ کرکے عربی کا سب سے
بڑا لغت لسان العرب خریدا ہے۔ عارضی طور پر ادارے کے رفقاء ان کی کتابوں سے بھی فا

اُٹھا سکیں گے۔

میں اپنی صحت اور عمر کے لحاظ سے اب کچھ زیادہ فرصت کار کی امید نہیں رکھتا اس وجہ سے اپنی اس آرزو کو اپنی زندگی کی آخری آرزو سمجھتا ہوں۔ رب کریم کی رحمت سے بعید نہیں کہ اس کے ایک عاجز اور گنہگار بندے کی یہ آرزو پوری ہو جائے۔ میں اپنے ان تمام دوستوں، قدردانوں، ساتھیوں اور ہمدردوں کا شکر گزار اور ان کیلئے دل سے دعا گو رہوں گا جو اس آرزو کی تکمیل میں کسی پہلو اور کسی نوعیت سے بھی میری ہمت افزائی کریں گے۔

(۴)

اُوپر کی سطریں لکھی جا چکی تھیں کہ اس سلسلہ میں ایک ایسی چیز سامنے آئی جو ایک فال نیک کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے جی چاہتا ہے کہ اس مقصد کے قدر دانوں اور ہمدردوں کو بھی اس کی اطلاع دے دی جائے۔ اس ادارے کے لئے کسی موزوں مکان کا خیال عرصہ سے ذہن میں تھا لیکن لاہور میں کسی مکان کا ملنا ہی ایک بڑا کٹھن مرحلہ ہے چہ جائیکہ کسی موزوں مکان کا ملنا۔ لیکن ادھر یک بیک بالکل تائید غیبی سے ایک ایسے مکان کے ملنے کی صورتیں پیدا ہو گئیں جو ہمارے پیش نظر مقاصد کے لئے نہایت مناسب ہے۔ مکان کی مشکلات کے پیش نظر رفقا کا مشورہ یہی ہُوا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے چنانچہ یہ مکان کرایہ پر حاصل کر لیا گیا ہے۔ اب تک اس ادارے کا سارا کام میری قیام گاہ پر ہوتا رہا تھا حلقہ پر کسی خرچ کا بار نہیں تھا۔ یہ پہلا کام ہم نے ایک ایسا کیا ہے جس کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔ اس خرچ کے فراہم ہونے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ کچھ تو حلقہ کے رفقا اپنے ذمہ لیں اور کچھ ہمارے مخلصین اور ہمدرد حضرات اس میں تعاون کریں۔ اس طرح گویا عملاً اس مکان میں ادارے کی بنیاد پڑ جائے گی۔ اگرچہ یہ بنیاد ابھی بالکل ایک ابتدائی شکل میں ہو گی لیکن کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس بنیاد پر ایک مستقل ادارے کی عمارت قائم ہو جائے۔

جہاں تک میری عقل و فہم کا تعلق ہے اس کی رہنمائی میں یہ بات میں پُورے اعتماد و یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس وقت اس ملک میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ ایسے

اشخاص تیار کئے جائیں موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے والے اور دین میں بصیرت رکھنے والے رجال۔ ایسے اشخاص ہی کے پیدا ہونے پر ان تمام کاموں کا انحصار ہے جو مسلمانوں کی صلاح و فلاح کیلئے کئے جاسکتے ہیں۔ اس وقت تو قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ ہمیں بھی ذاتی تجربہ سے معلوم ہوا اور دوسرے مخلصین بھی جگہ جگہ سے شکایت لکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے اپنے شہروں میں حلقہ تدبر قرآن کے نمونہ پر حلقے قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسے آدمی نہیں دستیاب ہو رہے ہیں جو کامیابی کے ساتھ نئی نسل کو دین کی تعلیم دے سکیں۔ بعض دینی درسگاہوں میں بھی یہ کام شروع ہوا لیکن ان کے طریقہ تعلیم کی فرسودگی کے سبب سے کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کو بڑی آسانی سے دین کی تعلیم دی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ ہمارے پیش نظر پہلی مہم اشخاص کی تیاری کی ہے۔ کچھ اشخاص کے تیار ہو جانے کے بعد ہی مزید اشخاص کے تیار کرنے اور پھر عام اصلاح و تربیت کے لئے آگے کے قدم اٹھائے جاسکتے ہیں۔ کیا عجب کہ یہیں سے کسی صحیح قسم کی تنظیم کے لئے بھی راہ کھل سکے جس کے لئے بہت سے مخلصین اپنے اندر بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سب سے پہلے دین میں بصیرت رکھنے والے اشخاص تیار کئے اور پھر ان کو عام اصلاح و دعوت کا ذریعہ بنایا۔ میں نے اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق دین کی یہ خدمت شروع کر دی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں مدد فرمائے گا اور دین سے محبت رکھنے والوں کا مجھے تعاون حاصل ہوگا۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

(۳۱)

۶۰۔ آگے کا سلسلہ کلام آیات (۱۷۸-۱۷۹)

برّ و تقویٰ کی اصلی حقیقت واضح کرنے کے بعد اُن معاملات کی طرف توجہ فرمائی جو اسی برّ و تقویٰ پر مبنی ہیں اور جن کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ انہی پر معاشرہ کے امن و عدل اور اس کے تحفظ و بقاء کا انحصار ہے۔ اگر ایک متوسط درجہ کا ذہن رکھنے والا آدمی بھی غور کرے گا تو وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ انسانوں اور انسانوں کے تعلقات کی استواری کی بنیاد اصلاً دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کی جان کا احترام کرے، دوسرے اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کے مال کا احترام کرے۔ اسی وجہ سے حرمت جان اور حرمت مال کے قانون کو ہمیشہ سے دوسرے تمام قوانین پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اسی اصل کے تحت، جو تمام تر فطرت انسانی پر مبنی ہے، قرآن نے بھی برّ و تقویٰ کی بنیاد استوار کرنے کے بعد سب سے پہلے احترام جان کے قانون کو لیا اور قصاص کو پورے معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا۔ یعنی اگر کوئی شخص قتل ہو گیا ہے تو یہ صرف اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے قاتل کا کھوج لگائیں اور اس کو سزا دیں بلکہ پورے معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے اور اس کو کیفر کردار کو پہنچائے۔ گویا ایک شخص کا قتل ہونا سب کا قتل ہونا اور اس کا زندہ ہونا سب کا زندہ ہونا ہے۔

قصاص کا یہ قانون موجود تو اہل کتاب کے ہاں بھی تھا اور اہل عرب کے ہاں بھی مگر انہوں نے جس طرح ہر قانون کی رُوح کچل کے رکھ دی تھی اسی طرح اس قانون کی رُوح بھی ختم کر دی تھی۔ اس قانون کی اصل روح بے لاگ انصاف اور کامل مساوات ہے۔ یعنی اس معاملہ میں ادنیٰ و اعلیٰ، امیر غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام سب ایک ہی سطح پر رکھے جائیں اور قانون اور عدالت، دونوں کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں۔ لیکن یہ بات نہ اہل کتاب کے یہاں باقی رہ گئی تھی نہ اہل عرب کے یہاں بلکہ یہ کہنا بھی شاید بیجا نہیں ہوگا کہ آج بھی تہذیب و تمدن کی اس ترقی کے باوجود دنیا کے کسی ملک اور کسی قانون میں بھی احترام جان اور مساوات کا یہ تصور نہیں پایا جاتا جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

"اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے۔ پس جس کسی کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لئے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لئے قصاص میں، اے عقل والو، زندگی ہے۔ تاکہ تم حدود الٰہی کی پابندی کرو۔"

۶۱۔ الفاظ کی شرح اور جملوں کی وضاحت

قصاص، قصص سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقش قدم کے ساتھ چلنے کے ہیں۔ مثلاً۔ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۱۱۔ قصص (اور اس نے اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا، تو وہ

سے اس کو دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوا) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۴، کہف (اس نے کہا یہی تو ہمیں مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نقش قدم کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پلٹے) اسی سے قصہ کو قصہ کہتے ہیں، کیونکہ جس کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، قصہ بیان کرنے والا گویا اس کے قدم بہ قدم اس کے حالات کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی سے قصاص نکلا اس لئے کہ قاتل کا بھی کھوج لگایا جاتا اور اس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ پھر قصاص اس سزا کو کہنے لگے جس میں مجرم کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے۔ اس قصاص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جانی، دوسری مالی جس کو دیت یا خونبہا کہتے ہیں۔ قصاص کا لفظ اپنے وسیع معنی میں ان دونوں ہی صورتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس لئے کہ دیت بھی درحقیقت قصاص ہی کی ایک شکل ہے۔ اصل قانون تو جان کے بدلے جان ہی کا ہے۔ لیکن اولیائے مقتول کی بہبود کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں اتنی رعایت فرما دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جان کے بدلے دیت بھی لے سکتے ہیں۔

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى" میں کُتِبَ کے بعد عَلٰی کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اس کے اندر فرضیت اور وجوب کا مضمون موجود ہے۔ قتلٰی قتیل کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر کُتِبَ عَلَيْكُمْ سے قصاص کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تو اس حکم کا مخاطب کون ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ قصاص کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے۔ اگر مقتول کے ورثہ چاہیں تو قاتل کو قتل بھی کر سکتے ہیں، چاہیں تو دیت بھی لے سکتے ہیں، چاہیں تو کچھ معاف بھی کر سکتے ہیں۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ "تم پر قصاص لینا فرض کیا گیا ہے"!

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت ہے۔ اس کے اوپر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اس کے علاقہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، ان کو گرفتار کرے اور قانون کے مطابق ان پر سزا نافذ کرے۔ یہ ذمہ داری معاشرہ یا حکومت پر اس اصول کے تحت ڈالی گئی ہے کہ جو شخص کسی شخص کو بغیر کسی حق قانونی کے قتل کر دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ

سب کا قاتل ہے اس لئے کہ اس نے تحفظ جان کے اس قانون کو ہدم کر دیا ہے جو سب کے لئے تحفظ جان کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ پورے معاشرہ اور پورے نظام اجتماعی کی ذمہ داری ٹھہری کہ سب اس کے قصاص کے درپے ہوں اور اس وقت تک دم نہ لیں۔ جب تک حرمت جان کے اس قانون کو زندہ کر کے سب کی زندگی کی ضمانت کو بحال نہ کرلیں اسی حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔ اِنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۳۲ (کہ جس نے کسی جان کو بغیر اسکے کہ اس نے کسی کی جان ماری ہو، یا زمین میں فساد مچایا ہو قتل کر دیا تو گویا اس نے سارے ہی لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا سب کو زندہ کیا)

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قصاص کی اصل ذمہ داری حکومت ہی پر ہونی چاہئے نہ کہ مقتول کے وارثوں پر اس لئے کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص قتل ہو جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہ ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص کے کچھ ورثا ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے قصاص کے معاملہ سے کچھ دلچسپی نہ ہو۔ بلکہ امکان تو خاصی حد تک اس بات کا بھی ہے کہ ورثہ کی اصل ہمدردی اور دلچسپی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکائے کار ہی کے ساتھ ہو جائے۔ علاوہ ازیں کسی اس طرح کے معاملہ میں تحقیق و تفتیش کی ذمہ داریاں اور پھر حدود کی تنفیذ بڑے وسیع اختیارات کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے جہاں تک قصاص لینے کے فرض کا تعلق ہے وہ تو اسلامی حکومت ہی پر عائد کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں اس نے حکومت پر یہ پابندی بھی عائد کر دی ہے کہ وہ بجائے خود فیصلہ کرنے کے مقتول کے اولیاء کو یہ اختیار دیدے کہ وہ اسلامی قانون کے حدود کے اندر مجرم کے ساتھ جو معاملہ پسند کریں وہ کرلیں خواہ اسے قتل کر دیں، خواہ اس سے خونبہا قبول کرلیں۔ ورثہ کو یہ اختیار دے دینا اور ان کے اختیار کو نافذ کر دینا حکومت کو اس فرض سے سبکدوش کر دے گا جو اس پر كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى کی رو سے عائد ہوتا ہے۔

قصاص کے معاملہ میں مقتول کے اولیاء کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے یہ مختلف پہلوؤں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے

سے ایک تو ان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ اُن کا براہِ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے، تیسرے دیت کی شکل میں مقتول کے ورثہ کی، بالخصوص جب کہ وہ غریب ہوں، ایسی مدد ہو جاتی ہے جس سے ان کو بڑا سہارا مل سکتا ہے۔ اگر ورثا کو اس میں کوئی دخل نہ رہ جائے، سارا اختیار پولیس اور عدالت ہی کو سونپ دیا جائے، جیسا کہ موجودہ قوانین میں ہے تو وُہ ان تمام فواید سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ لیکن ان کے اس حق کے تسلیم کئے جانے کے باوجود قصاص کی اصل ذمہ دار اور اس کی تنفیذ کرنے والی ہے حکومت ہی اس وجہ سے اگر وہ کسی خاص معاملہ میں محسوس کرے کہ وارثوں کی سرد مہری یا ان کی قاتلوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے قصاص کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے جس سے حرمت جان کا قانون متاثر ہو رہا ہے تو وُہ اس نقصان سے قانون کو بچانے کے لئے مناسب اقدام کرے گی۔

● آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، عورت، عورت کے بدلے"۔ یہ اس کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھتی ہے۔ یعنی اگر ایک آزاد نے دوسرے آزاد کو قتل کیا ہے تو النفس بالنفس کے قانون کے بموجب وہ آزاد ہی اس آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور بصورت خونبہا ایک آزاد ہی کی دیت اس کے بدلہ میں واجب ہوگی۔ عرب جاہلیت کے طریقہ کے مطابق یہ نہیں ہوگا کہ مقتول کے ورثا اپنی شرافت و برتری کے زعم میں یہ مطالبہ کریں کہ وہ اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں قاتل کے خاندان کے دو یا اس سے زیادہ آزادوں کو قتل کریں گے، یا عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کریں گے یا غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل کریں گے یا بصورت دیت عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر وصول کریں گے یا غلام کی دیت آزاد کی دیت کے معیار سے لیں گے۔ اسی طرح قاتل اور اس کے خاندان و قبیلہ والوں کو بھی اپنی شرافت و نجابت اور برتری کے زعم میں یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ ہمارا غلام دوسروں کے آزاد کا کفو یا ہماری ایک عورت دوسروں کے مرد کے برابر ہے اس وجہ سے ہم قصاص جانی یا مالی میں اسی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے مقتول کے ورثہ سے معاملہ کریں گے۔ اسلام

نے اس اعلان مساوات کا اعلان کر کے زمانہ جاہلیت کی مذکورہ تمام نابرابریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہود نے بھی اس معاملہ میں شریف ورذیل اور اسرائیل اور غیر اسرائیل کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ اس اعلان سے اس امتیاز کی بنیاد بھی ڈھ گئی۔ ایک طرف اسلام کے اس قانون کو ملاحظہ فرمائیے، جو چودہ سو سال سے اسلام کی کتاب تعزیرات میں موجود ہے، دوسری طرف عدل ومساوات کے علمبردار امریکہ میں کالوں اور گوروں کے اس امتیاز پر نظر ڈالئے جو زندگی کے ہر شعبہ میں آج اس بیسویں صدی میں بھی برتا جا رہا ہے۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی اگر مقتول کے ورثا کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی گئی۔ اس چھوٹ کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ قصاص جانی کے بجائے قصاص مالی پر راضی ہو جائیں تو قاتل اور اس کے خاندان والوں کا فرض ہے کہ وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ معروف کے بموجب دیت ادا کر دیں اور ادائیگی نہایت حسن وخوبی کے ساتھ کریں۔ معروف سے مراد یہاں اہل عرب کا رواج اور دستور ہے جس کو دیت کے معاملہ میں اسلام نے قانون کی حیثیت دے دی۔ حسن وخوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لئے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں بلکہ جنس ومال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہو تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلہ اور کھجور کی مقدار وکمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے لیکن باعتبار حقیقت وکیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنہوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی، فیاضی اور اس کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ اُن کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انہوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔

قصاص کے حکم کے تحت یہاں بغیر کسی سابق قرینہ کے جو خونبہا کا ذکر آگیا ہے تو اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے یعنی قصاص کا لفظ اپنے عام مفہوم میں قصاص جانی اور

قصاص مالی دونوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ چھوٹ ملنے کے معنی جیسا کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ کے الفاظ سے واضح ہے یہ ہے اولیائے مقتول جان کے بدلے جان لینے کے بجائے رواج کے مطابق خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ یہ خونبہا کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رعایت و رحمت ہے جرمت جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی سے اس میں رعایت فرما دی ہے تو اس رعایت کی قدر کرنی چاہیئے اور اس سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد کسی ظلم و زیادتی کی راہ کھولیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ پھر ان کے لئے آخرت کا عذاب دردناک ہی ہے جس سے چھڑانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ اس میں قاتل اور اس کے خاندان والوں کے لئے بھی تنبیہہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفران نعمت ہوگا کہ اس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لئے اسکیم بنائی جائے۔ مثلاً یہ کہ قاتل اور اس کے اعزا یہ منصوبہ بنائیں کہ اس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو دیت پر راضی کر کے اپنی جان بچا لو پھر موقع پیدا کر کے ان کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اسی طرح اس میں مقتول کے وارثوں کے لئے بھی تنبیہہ ہے کہ انہیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیئے کہ اس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریق کو سچے دل سے اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ .... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ | یہ معاشرہ کو تلقین ہے کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی جانبداری، کسی چشم پوشی اور کسی بیجا رحم و مروت کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ جو شخص کسی کو قتل کرتا ہے وہ صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا بلکہ اس قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کی حفاظت کا ضامن ہے اس وجہ سے وہ گویا سب ہی کو قتل کر دیتا ہے اس وجہ سے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا قصاص لے کر اس ضمانت کو بحال کریں جس میں

سب کی زندگی ہے۔ معاشرہ کا جو شخص کسی قاتل کو پکڑتا ہے، یا اس کا سراغ لگاتا ہے یا اس کے جرم کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس طرح مقتول سے قصاص کی راہ کھولتا ہے وہ گویا اس مقتول کو بھی زندہ کرتا ہے اور ساتھ ہی پورے معاشرہ کو بھی زندگی بخشتا ہے کیونکہ وہ اپنی اس خدمت سے اس قانون کو زندہ کرتا ہے جو سب کے لئے زندگی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے جس کا حوالہ اوپر بھی گذر چکا ہے۔

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا۔ (۳۲۔ مائدہ)

یہ کہ جس نے قتل کر دیا کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا اس نے سب ہی کو زندہ کیا۔

اس میں اُن لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو بیجا قسم کی مروت و پاسداری یا ناروا قسم کے احترام شرافت و امارت کے جذبہ کے تحت بساط وقات مقتول کے بجائے قاتل ہی کی ہمدردی کو ثواب قرار دے بیٹھتے ہیں حالانکہ اصلی ہمدردی ہر ایک کے ساتھ، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، قریب ہو یا بعید، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ میں ہے، یہی ہے کہ اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کیا جائے نہ کہ خُدا کے قانون سے چھڑا کر شیطان کے حوالہ لیکن اس حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔ اس وجہ سے آیت میں اہلِ عقل کو خاص طور پر خطاب فرمایا ہے۔

اہل عقل کو خاص طور پر توجہ دلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح جذبات بعض اوقات قانون قصاص کے نفاذ میں مزاحم ہوتے ہیں اسی طرح جذبات سے مرعوب و مغلوب عقل بھی اس قانون کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر اس زمانہ میں تو تمام جسمانی سزاؤں کے خلاف ایک مستقل فلسفہ بن گیا ہے جس کو پیش تو کیا جاتا ہے عقلیت اور فلسفہ کے روپ میں لیکن تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی اصلی رُوح عقل کی نہیں بلکہ جذبات ہی کی ہے۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مجرموں سے جو جرم سرزد ہوتے ہیں وہ اصلاً جذباتی بے اعتدالی،

عقلی عدم توازن اور ذہنی انتشار اور الجھاؤ کے نتیجہ میں صادر ہوتے ہیں اور یہ حالتیں آدمی کی بیماری کی حالتیں ہیں جن میں وہ مستحق اصلاح و تربیت اور علاج و دوا کا ہوتا ہے نہ کہ سزا کا۔ اس وجہ سے اس گروہ کے نزدیک کسی قاتل کو قتل کی سزا دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو بیمار ہونے پر اس کے علاج کے بجائے کوئی سزا دے دینا۔ اس گروہ کے نزدیک اس طرح کے مجرموں یا خود ان کے الفاظ میں اس طرح کے مریضوں کا علاج تعلیم و تربیت اور اصلاح نفسی و ذہنی کے ذریعہ سے ہونا چاہئیے نہ کہ سولی اور پھانسی سے۔

یہ نظریہ موجودہ دنیا میں ایک خاص گروہ میں شروع سے رہا ہے لیکن اس کو عملی اعتبار سے کبھی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی حاصل ہو سکے۔ تاہم اس دورِ آخر میں چونکہ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی جیسے لوگوں نے اس کی وکالت کی ہے اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن اس سے متأثر ہیں۔ ایسے لوگوں کی الجھن دُور کرنے کے لئے قانون قصاص کی اس حکمت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن خاص طور پر اہل عقل کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس کے اندر زندگی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہو گئی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کے قتل سے پورے معاشرے کے لئے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے وہ خرابی . . . .

. . . .

. . . . . . پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے اور پھر اس کی ہلاکت انگیزیوں سے معاشرے کو بچانا ناممکن ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لئے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگدلی اختیار کرنی پڑتی ہے

اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے یہ سنگدلی اختیار نہ کرے تو اس ایک عضو کی ہمدردی میں اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالہ کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ عضو مریض پر اپریشن کر کے اس کو جسم کے مجموعہ سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے اس وجہ سے نرمی اور ہمدردی کا مستحق ہے تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ ایک عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔

یہی نکتہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کی سزاؤں کو جو سخت نوعیت کی ہیں 'نکال' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ نکال عربی میں اس سزا کو کہتے ہیں جو دوسروں کو عبرت دلانے والی ہو جس کو دیکھ کر دوسرے نصیحت پکڑیں اور اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کی سزائیں نافذ کر کے گویا پورے معاشرہ کو ایسے ٹیکے لگا دیے جاتے ہیں جس سے وہ متعدی جراثیم کے اثرات سے محفوظ ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں بھی قرآن نے 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں تاکہ تم بچو یعنی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

۶۲- آگے کا سلسلہ کلام آیات (۱۸۰-۱۸۲)

حرمت جان کے اس قانون کے بعد حرمت مال کے قانون کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ دونوں مضمون قرآن و حدیث[1] دونوں میں بالعموم ساتھ ساتھ آتے ہیں اور عقل و فطرت میں بھی ان دونوں کے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔ حرمت مال کے سلسلہ میں بنیادی چیز یہ ہے کہ ایک قانون کے تحت ہر شخص کے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین و محفوظ ہوں اور دوسرے ان حقوق کا احترام کریں۔ اہل عرب میں اگرچہ معروف کے تحت والدین اور اعزا و اقربا کے حقوق کا اجمالاً تعین تھا لیکن ان کی زندگی کے ہر پہلو میں جس طرح خرابیاں پیدا ہو گئیں اسی طرح اس پہلو میں

[1] ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ نساء۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ حرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ (اس کے مال کی حرمت اس کی جان کی حرمت کی طرح ہے)

فساد رونما ہوا اور ان کے زور آور لوگوں میں کمزور وارثوں اور حقداروں کے حقوق ہڑپ کر لینے کا رجحان
اس شدت کے ساتھ زور پکڑ گیا کہ معروف کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی۔
سورہ فجر میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے "وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا" (اور
تم وراثت کو سمیٹ کر کھاتے ہو) یہ صورت تقاضا کر رہی تھی کہ قانون کے ذریعہ سے اعزا و اقربا
کے حقوق کا تعین کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا جائے لیکن اس سورہ کے زمانہ نزول تک
معاشرہ ابھی اتنا مستحکم نہیں ہوا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ مستقل قانون نافذ ہو سکے جو سورۂ نساء
میں ہے اس وجہ سے عبوری دور کے لئے مورثوں کو دستور کے مطابق والدین اور قرابت مندوں
کے لئے وصیت کی ہدایت ہوئی اور وارثوں کو اس وصیت کی تعمیل کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے
وارثوں کے حقوق کے تعین سے متعلق خود اپنی وہ وصیت نازل فرمادی جو سورۂ نساء میں مذکور ہے
تو بندوں کی وصیت منسوخ ہوگئی صرف اللہ تعالیٰ کی وصیت باقی رہ گئی۔ پھر بندوں کے لئے
وصیت کا حق صرف ایک محدود دائرہ کے اندر رہ گیا جس کا ذکر سورہ نساء کی مذکورہ آیت کے
تحت آئے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

"جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آن پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا
گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کرنا، خدا سے ڈرنے
والوں پر یہ حق ہے۔ تو جو لوگ اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان
بدل ڈالنے والوں ہی پر ہے، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ جس کو کسی وصیت
کرنے والے کی طرف سے کسی بے جا جانبداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو
اس میں کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔"

۶۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

كُتِبَ عَلَيْكُمْ .... حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ | "كُتِبَ عَلَيْكُمْ" فرض کر دینے کے معنی میں قرآن اور کلام عرب دونوں میں معروف ہے۔ وصیت کے لفظ کی تحقیق پچھلے صفحات میں گذر چکی ہے کہ عربی میں یہ لفظ کسی بڑے کی طرف سے چھوٹوں کو تلقین و ہدایت کے معنی میں آتا ہے عام اس سے کہ یہ تلقین و ہدایت کوئی شخص اپنے آخری وقت میں کرے یا عام حالات میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، قرآن میں اُن کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں لفظ وصیت چونکہ مصدری معنی میں ہے، نیز اپنے فعل سے فاصلہ پر واقع ہے، اسی وجہ سے تذکیر و تانیث کا لحاظ نہ تو فعل میں ضروری ہوا نہ بعد کی ضمیروں ہی میں۔

اس وصیت کی فرضیت کے ساتھ دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس وقت کرے جب اسے اپنی موت قریب ہوتی نظر آنے لگے، دوسری یہ کہ جب وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو۔ پہلی شرط کا ذکر "اذا" کے ساتھ کیا ہے اس لئے کہ موت کا مرحلہ سب کو پیش آتا ہے دوسری کا ذکر اِن کے ساتھ کیا ہے اس لئے کہ مال کا ہونا ہر ایک کے پاس ضروری نہیں، "ان" اور "اذا" کے استعمال کا یہ فرق عربی زبان کے طلبہ سے مخفی نہیں۔ وصیت میں یہ دونوں پہلو بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ جو لوگ اپنی چلتی پھرتی زندگی میں وصیت کر دیتے ہیں وہ بسا اوقات بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں اور جو لوگ مال رکھتے ہوئے وصیت سے گریز کرتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے پیچھے جھگڑے چھوڑ جاتے ہیں۔

خیر کے اصل معنی مطلوب و مرغوب شے کے ہیں اس وجہ سے علم، عقل، حکمت، عدل نیکی اور بھلائی سب کے لئے اس کا استعمال ہے۔ پھر یہیں سے یہ مال کے لئے بھی استعمال ہونے لگا اس لئے کہ مال بھی ایک مرغوب و مطلوب شے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کی جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے حوالہ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے مال کے لئے اس لفظ کو اختیار کر کے گویا بالواسطہ اس غلط فہمی کی اصلاح کر دی ہے جو عام طور پر رہبانی تصور کے زیر اثر لوگوں میں پھیلی ہوئی تھی کہ مال فی نفسہ ایک ناپاک و نجس چیز ہے۔ اس وجہ سے اللہ والوں کے لئے اس سے آلودہ ہونا جائز نہیں۔

معروف کے لغوی معنی جانی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، یعنی جس کو عقل مانتی ہو، جو عدل پر پوری اترتی ہو، اچھے لوگ جسے پہچانتے ہوں، سوسائٹی کے شریفوں میں جس کا چلن اور رواج ہو۔ یہ معروف بہت سے معاملات میں اسلامی قانون کا درجہ رکھتا ہے اور اس حیثیت سے قرآن میں اس کا جگہ جگہ حوالہ آیا ہے۔ اُوپر دیت کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ قانون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وُہ جو معروف پر مبنی ہے، دوسرا وہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہے۔ جس چیز کے بارے میں خدا کا قانون موجود نہ ہو اس میں معروف معتبر ہوتا ہے۔ لیکن جس باب میں خدا کا قانون نازل ہو گیا اس میں معروف کا اعتبار ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

اس آیت میں والدین اور اقربا کے لئے جو وصیت کا حکم دیا گیا وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دَور کے لئے تھا جبکہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لئے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے۔ اور دوسرے اس معروف کو از سر نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانہ قدیم سے معتبر تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لئے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔

اس وصیت کے متعلق فرمایا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ حَقًّا فعل محذوف کی تاکید کے لئے ہے۔ یعنی یہ تمام اہل ایمان پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں واجب اور ضروری ہے، جو اس سے گریز کریں گے ان کے سینے خوف خدا سے خالی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عبوری مدت میں، جو اصل قانون وراثت سے پہلے گذری، ہر مسلمان پر اس کی تعمیل ضروری تھی، اس کی حیثیت صرف ایک نیکی اور فضیلت کی نہیں تھی۔

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ .... إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ | چونکہ اس قانون کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا تمام تر انحصار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت ہی پر تھا اس لئے

میں وارثوں کے حقوق کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا' اس وجہ سے شاہدوں کی عظیم ذمہ داری واضح فرما دی کہ اگر وہ صاحب وصیت کی وصیت میں کوئی رد و بدل کریں گے تو اس کا سارا بارِ گناہ انہی کے سر ہوگا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہ تو صاحب وصیت پر عائد ہوگی نہ اس کو نافذ کرنے والوں پر۔ سمیع و علیم کی صفات کے حوالہ میں تبدیلی کی جسارت کرنے والوں کے لئے تنبیہہ اور دھمکی ہے کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، وہ اس جرم عظیم کی سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا ...... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "خوف" کے اصل معنی گمان کرنے، خیال کرنے، توقع کرنے، اندیشہ کرنے کے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ ڈرنے کے معنی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ایک حماسی شاعر کا شعر ہے۔

ولو خفت انی ان کففت تحیتی

تنکب عنی رمت ان یتنکبا

اگر مجھے توقع ہوتی کہ اگر میں بڑھاپے کا خیر مقدم نہ کروں گا تو وہ مجھ سے رک جائے گا تو میں اپنے خیر مقدم سے باز رہ کر اس کو روکنے کی کوشش کرتا۔

یہاں زیر بحث آیت میں یہ لفظ اندیشہ، گمان اور علم ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ صاحب کشاف نے اس معنی کی طرف اشارہ تو کیا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ ہم نے اس کی دلیل پیش کر دی ہے۔

"جَنَفٌ" کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں لیکن اس کا غالب استعمال نیکی اور حق سے ہٹ کر برائی اور ناانصافی کی طرف مائل ہونے کے لئے ہے۔ آیت میں یہ بیجا پاسداری اور ناروا جانبداری کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"اثم" میں اصلاً تاخر یعنی پیچھے رہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو قافلہ میں تھک جانے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ پھر یہ لفظ ادائے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لئے استعمال ہوا، عام اس سے کہ وہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے۔ اپنے اس مفہوم کے لحاظ سے یہ "بر" کا ضد ہے اس لئے کہ "بر" کا اصل مفہوم، جیسا کہ ہم آیت ۱۷۷

کے تحت واضح کر چکے ہیں، اتفاے حق ہے۔ یہ لفظ "عدوان" کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ حقوق کے معاملہ میں گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کوتاہی اور حق تلفی کی نوعیت کے، دوسرے دست درازی اور تعدی کی نوعیت کے۔ پہلی قسم کے لئے اثم کا لفظ ہے، دوسری کے لئے عدوان کا۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ جنف کے ساتھ استعمال ہوا ہے جنف کے معنی ہم واضح کر چکے ہیں کہ جانبداری کے ہیں اس کے بالمقابل اثم کا ٹھیک مفہوم حق تلفی کا ہوگا۔ اور ایک نامنصف وصیت کرنے والے سے انہی دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے یا تو وہ وارثوں میں سے کسی ایک کی جانبداری کرے گا یا کسی کی حق تلفی کا مرتکب ہوگا۔

اوپر والی آیت میں وصیت کرنے والے کی وصیت میں کسی تبدیلی کرنے کی نہایت شدت کے ساتھ ممانعت فرمائی گئی تھی اب اس آیت میں یہ ارشاد ہوا کہ تبدیلی کی یہ ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے۔ اگر کسی وصیت کرنے والے کے اندر جانبداری یا حق تلفی کا رجحان محسوس ہو رہا ہے یا اس کی وصیت واضح طور پر جانبداری اور حق تلفی کا پہلو لئے ہوئے ہے تو وصیت کے گواہوں کی طرف سے اس جانبداری اور حق تلفی کی اصلاح کی کوشش اس تبدیلی کے حکم میں نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ یہ چیز جائز ہے۔ البتہ یہ اصلاح انہیں بطور خود کر دینے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کے لئے انہیں فریقوں کے درمیان سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اگر اس کا موقع ہے کہ خود وصیت کرنے والے کو سمجھا بجھا کر عدل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو یہ راہ اختیار کی جائے ورنہ بصورت دیگر وارثوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی جائے۔ یہ مفہوم فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لئے کہ ان الفاظ کا واضح مفہوم ان کے درمیان مصالحت کرا دینا ہے نہ کہ بطور خود کوئی اصلاح کر دینا۔

۶۴۔ آگے کا سلسلۂ کلام آیات (۱۸۳۔۱۸۷)

حرمت جان اور حرمت مال کے مذکورہ بالا قوانین کے بعد اب یہ روزے اور اس سے متعلق احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ہماری معروف فقہی ترتیب کے لحاظ سے تو روزہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے اس وجہ سے خیال دل میں یہ گذرتا ہے کہ اس کا ذکر ادھر کی اس آیت کے ساتھ ہونا تھا جس میں نماز اور انفاق کا ذکر ہے لیکن قرآن حکیم میں احکام کے بیان کی ترتیب فقہا میں ہے

ہماری فطرت کی تقاضوں میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ حکمت شریعت، اصلاح معاشرہ، تزکیہ نفوس اور رعایت احوال کے تقاضوں کے تحت ہے۔ ان پہلوؤں سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حرمت جان و حرمت مال کے قوانین کے بعد یہ روزے کا بیان اس عبادت کو سامنے لا رہا ہے جو ضبط نفس اور تربیت تقویٰ کے لئے اسلام نے مقرر کی ہے تاکہ طمع اور اشتعال، لالچ اور انتقام، خواہش اور ہیجان کے غیر معتدل رجحانات و داعیات کو انسان لگام لگا سکے اور اپنے رہوار نفس کو اس راستہ پر ڈال سکے جو تقویٰ کا راستہ ہے۔ روزہ صبر اور تقویٰ پیدا کرنے کی خاص عبادت ہے اور یہی صفات ہیں جو انسان کو دست درازی اور حق تلفی سے بچاتی بھی ہیں اور بر و احسان اور حق و عدل کے قیام پر ابھارتی بھی ہیں۔ چنانچہ یہاں روزے کا حکم جس طرح پچھلے احکام پر عمل کے لئے تربیت کی بنیاد قائم کرتا ہے اسی طرح اس کے بعد جو احکام رشوت دہی کی ممانعت اور حج و جہاد سے متعلق آرہے ہیں ان کے لئے بھی صبر کی اساس فراہم کرتا ہے۔ گویا ترتیب میں اس کے موقع و محل ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ روزہ اسلام میں کیوں فرض کیا گیا اور اس کے مقاصد و فوائد کیا ہیں، زندگی کن پہلوؤں سے اس سے متاثر ہوتی ہے اور پھر حیات اجتماعی پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَي الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا ھَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تم تقوای حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کردے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

رمضان کا مہینہ ہے کہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیئے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔

تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم

اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے تمہارے لئے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔ اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

افاداتِ فراہیؒ
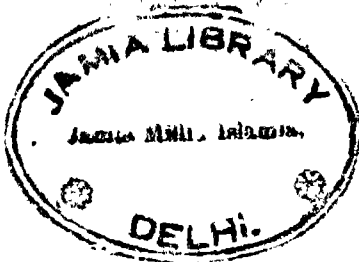
جناب خالد مسعود صاحب

شریعت کی بنیاد اور اس کا مقصد

خدا کی شریعت انسان کے ان اخلاق پر مبنی ہے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں مثلاً شکر، عدل اور احسان۔

وہ چیز جس سے تمام مکارم اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور جو ان کا فلسفہ اور روح ہے، آدمی کی اپنے رب کے ساتھ نسبت ہے۔ اس نسبت کی پہلی صورت محبت اور شوق ہے جس کے بعد رب کریم کی نعمتوں اور اس کی رأفتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل اپنا فقر اور درماندگی کھل کر سامنے آتی ہے۔ یہیں سے شکر کی بنیاد پڑتی ہے جو انسان کا سب سے پہلا فریضہ ہے۔

خدا کی رافت و رحمت کے نتیجہ میں خلق سے محبت پیدا ہوتی ہے، اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کے مقابل میں انسان اپنے آپ کو ترجیح نہ دے۔ یہ عدل ہے۔ اگر انسان کی فطرت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کئی حقوق واجب ہیں، جن کی ادائیگی وہ لوگوں کی ملامت کے خوف سے یا حکومت کی سزا اور خدا کے عذاب سے ڈر کر یا محض عادتاً کرنے پر مجبور نہیں بلکہ یہ خطرات اگر نہ بھی ہوں جب بھی وہ ان حقوق کو لازم سمجھ کر ادا کرے گا فطرت کے اس حکم کی تعبیر عدل سے کی جاتی ہے جو کسی خاص حق کو نہیں بلکہ تمام حقوق کو محیط ہے اور جہاں بھی کوئی حق ہوگا وہ عدل کا محل ہوگا۔ عدل کی بنیاد چونکہ حق پر ہے اس لئے بندے اپنے رب کا شکر ادا نہ کر سکتے تھے جب تک خدا پر ان کا حق نہ ہو جاتا۔ سو اللہ جل شانہٗ نے محض اپنی مہربانی سے ان کا حق ٹھہرا دیا۔

اسی عدل کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو دوسروں کے حقوق کے علاوہ ہے۔ اور وہ ہے اس حق کی ادائیگی جو خود آدمی کے اندر ہے۔ آدمی کا مال اور اس کی جان چونکہ خدا کی بخشی ہوئی ہے اس لئے ان پر آدمی کا مجرد حق نہیں ہے۔ اس لحاظ سے عدل یہ ہوگا کہ آدمی کا عمل اس کی ذات کے حق کے ساتھ موافقت رکھتا ہو۔ اسی بنا پر آخرت میں بندوں سے ان کے تمام افعال کے بارے میں سوال ہوگا۔

خلق کی محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی دوسروں کے ساتھ عدل کرنے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان پر فضل بھی کرے۔ یہ احسان کا درجہ ہے۔ بندوں پر احسان خدا کی نعمتوں کا شکر بھی ہے۔ جس پر احسان ہوا اس کے لحاظ سے تو یہ احسان ہے لیکن خدا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اس کا شکر ہے۔ جہاں تک احسان محض کا تعلق ہے وہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے لئے نہیں۔ احسان چونکہ واجب نہیں اس لئے یہ حق کے علاوہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ رحمت اپنے اوپر واجب ٹھہرالی ہے، یہ اس کا ایک مزید احسان ہے۔

دوسرے اعتبار سے غور کیا جائے تو آدمی کی اپنے رب کے ساتھ نسبت کا ایک پہلو اس سے دوری کا احساس ہے جس سے خدا کا خوف اور تقویٰ وجود میں آتے ہیں۔ اس سے آگے کی منزل تعبد اور سپردگی کی ہے اور اس کے بعد خدا کی کامل اطاعت کا مقام آتا ہے۔

سلبی پہلو سے دیکھا جائے تو یہی تقویٰ شریعت کی بنیاد ہے۔ یہی گناہوں سے روکنے والا اور نیکی کا حکم دینے والا ہے۔ خداوند کریم کا ارشاد ہے۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ	کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے
وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ	اور ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم رب العالمین کے آگے
وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوهُ وَهُوَ	سرنگندہ ہوں اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اسی سے
الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ٥	ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤگے

اس آیت میں پہلے اسلام کا اجمالی حکم دیا پھر رغبت و خوف کے دونوں احساسات کے ساتھ خدا کا ذکر کرنے کا تفصیلی حکم دیا۔ اس کے بعد اس چیز کو بیان کیا جو اسلام اور ذکر الٰہی کا باعث بنتی ہے، یعنی خدا کی طرف لوٹنے کا یقین۔ گویا معاد کا یقین نماز اور تقویٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ نماز رب سے قریب کرتی ہے اور تقویٰ اس کے غضب سے دور کرتا ہے۔ تقویٰ اس حقیقت کے

اعتراف ویقین سے پیدا ہوتا ہے کہ پروردگار ہمارے افعال سے واقف ہے اور نماز اس حقیقت کی یاد دہانی کا نتیجہ ہوتی ہے کہ پروردگار کی رحمت ہمارے اُوپر ہے۔

اُوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ شریعت کے تمام اوامر و نواہی ان فطری اخلاق کی تعبیر ہیں جو ہمارے نفوس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ تمام اوامر و نواہی جن کی بنیاد ہماری فطرت میں نہیں ہے نفس پر ظلم اور خدا کی تخلیق کا بگاڑ ہیں۔ ان کی حیثیت فساد فی الارض کی ہے اور نیکی کی راہوں سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

شرائع کا مقصد احکام شریعت کا اصل مقصد تزکیۂ نفوس ہے۔ جس طرح شرائع ہمارے اخلاق پر مبنی ہیں اسی طرح یہ ان اخلاق کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لئے نفس کی تربیت کا بھی ذریعہ ہیں اور یہی تزکیہ کا مقصود بھی ہے۔ اگر یہ اخلاقی تربیت علم و بصیرت کے ہمراہ ہو تو اس کو حکمت کہیں گے کیونکہ حکمت علم اور اخلاق کے تحت ہے اور حکیم وہ ہے جو عالم بھی ہو اور مہذب بھی۔

محاسن اخلاق فطری ہونے کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہیں ان کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ انہی کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے کو محبوب رکھتا ہے، ہر شخص چاہتا ہے کہ انہی محاسن کے ساتھ پہچانا جائے اور انہی کی بدولت اس کا ذکر باقی رہے۔ ان اخلاق کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ علم کے ساتھ جذبات کی آمیزش، حق کے ساتھ باطل کے امتزاج اور اصلاح میں فساد کی دراندازی کا نتیجہ ہے۔ اس اختلاف کی حکمت یہ ہے کہ اس دارِ فانی میں آدمی اپنے نفس کو سنوارنے کی جد و جہد کرے اور اپنے عمل کی بدولت ترقی حاصل کرے۔ وحی نفسِ انسانی ہی کی تعمیر، ازالۂ جہالت اور خواہش کے مرض سے نجات دینے کے لئے علم و عمل کے دو نسخے یعنی عقائد و شرائع لے کر آئی۔ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ان کی فطرت کے تقاضوں کی یاد دہانی کی گئی اور جس جبلت پر وہ پیدا ہوئے تھے، اس کو ان پر فرض ٹھہرا دیا گیا۔ اسی لئے وہ تمام اشخاص جو فطرت سے قریب ترین تھے حق کو سب سے پہلے ماننے والے بنے۔

فَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ سبقت کرنے والے آگے ہوں گے۔ وہی

مقرب ہوں گے۔

جس طرح عقل سے یہ ظاہر ہے کہ شرائع محاسن اخلاق کے کمال کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، اسی طرح وحی سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ذیل کی آیت ملاحظہ ہو۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

اے ہمارے رب ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمائیو جو ان پر تیری آیات پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اس آیت میں یہ بتایا کہ نبی لوگوں کو قرآن سُناتا ہے، ان پر جو شریعت فرض کی گئی ہے اس کی اور اس حکمت و بصیرت کی تعلیم دیتا ہے جو احکام شریعت میں ہے اور نتیجۃً ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری آیت ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

جیسا کہ ہم نے تمہارے اندر تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو اس کی آیات سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

مذکورہ آیات میں سے ایک آیت میں تزکیہ کا ذکر ابتداء میں اور دوسری آیت میں آخر میں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کتاب و حکمت کی غایت تزکیہ ہے جو قصد و ارادہ میں پہلے مقصود ہوتا ہے لیکن نتیجۃً آخر میں حاصل ہوتا ہے۔

آیت:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا

وہ کامیاب ہوا جس نے (نفس کو) نشوونما دی اور وہ رسوا ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

میں بھی تزکیہ سے صلاحِ نفس کو تعبیر کیا اور اسی کو آخری ہدف قرار دیا۔ دَسّٰھَا کا لفظ استعمال کر کے نفس کا فساد مُراد لیا۔

خود لفظ "تزکیہ" میں بھی اس بات کی دلالت موجود ہے کہ محاسنِ اخلاق کی جڑیں خود نفسِ

انسانی کی فطرت میں ہیں کیونکہ تزکیہ کا مطلب ہے ایک شے کو تمام آلودگیوں سے پاک کر کے اس کے اصل عنصر کی طرف لوٹانا ۔ قرآن نے اس کی تصریح فرمائی ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ○

بیشک ہم نے انسان کو اچھی ساخت پر پیدا کیا پھر ہم نے اس کو پست ترین مقام تک لوٹا دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے تو ان کے لئے غیر مقطوع اجر ہوگا۔

یعنی یہ کہ مومنین چونکہ نفس کی آلودگیوں سے ملوث نہیں ہوئے اور اپنی جدوجہد کی غایت کو پہنچے اس لئے وہ نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے کبھی نکالے نہ جائیں گے۔

آزمائش کے لئے نازل شدہ احکام

احکام شریعت کا اصل مقصد تو جیسا کہ معلوم ہو چکا، تزکیہ نفس ہے لیکن کبھی کبھی ایسے احکام کے نزول کی ضرورت ہوتی ہے جو اگرچہ مقصود بالذات نہیں ہوتے لیکن فرمانبردار اور نافرمان لوگوں یا کمزور ایمان اور مضبوط ایمان رکھنے والوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے ان کی حاجت ہوتی ہے۔ یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ باطن ظاہر پر اپنے اثرات ڈالتا ہے جس طرح آدمی کی نبض، اس کی آنکھ، زبان اور منہ سے اس کی صحت یا بیماری کے متعلق نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اسی طرح روزہ و نماز میں اس کی رغبت سے اس کے دل کی سلامتی یا خرابی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ بیماریوں کے علاج اور مفاسد کی اصلاح کے لئے ان اثرات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ۔ جہاں تک نفس کا معاملہ ہے، اس کا فساد بہت مخفی قسم کا ہوتا ہے اور صرف واقعات ہی سے اس پر تنبیہ ہو سکتا ہے ۔ مثلاً یہ بات کہ کوئی شخص بزدل ہے یا بہادر، خائن ہے یا ناشکرا، اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک کہ آزمائش کی آگ اسے تپا نہ دے ۔ آزمائش کے نتیجہ میں آدمی اپنے حال پر ٹھیک مطلع ہو کر اس کی اصلاح کرتا ہے ۔ گویا ظاہری صورت حقیقت کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے ۔ لیکن یہ مقصد اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی معنی کی طرف توجہ کرے اور احکام شریعت کی غایت کو سمجھتا ہو۔

طالوت کا اپنے لشکر کو نہر کا پانی پینے سے منع کرنے کا حکم اور یہود کو حِطَّۃٌ کی دعا مانگنے

کا حکم الٰہی ابتلائی احکام کے قبیل سے ہیں۔ طالوت نے جو حکم دیا اس کا منشا اہل استقامت کو ان لوگوں سے الگ کرنا تھا جن کا جماعت مجاہدین میں شامل رہنا نقصان دہ تھا۔ اسی طرح کا حکم مسلمانوں کو دیا جس کا منشا یہ تھا کہ حجاج کی جماعت سے فاسقین کو الگ کیا جائے فرمایا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (مائدہ ۹۴)

اے ایمان والو، اللہ تمہیں کچھ شکار سے ضرور آزمائے گا جس کو تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچیں گے یہ اس لئے کہ اللہ ان لوگوں کو متعین کرے جو غیب میں رہتے ہوئے اس سے ڈرتے ہیں۔ تو جس شخص نے اس کے بعد زیادتی کی اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

کبھی کبھی شریعت کے کسی حکم میں بھی ابتلا پایا جاتا ہے اگرچہ وہ حکم مقصود بالذات ہوتا ہے۔ اس کی مثال تحویل قبلہ کا حکم ہے۔ فرمایا

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ۔ (بقرہ ۱۴۳)

اور ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو تھا، نہیں ٹھہرایا مگر اس لئے کہ ہم جانیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اس شخص سے جو پیچھے پھر جاتا ہے۔

قبلہ کی تبدیلی کے اس حکم کے نتیجہ میں مسلمانوں کی جماعت میں سے کئی منافقین الگ ہو گئے اس تفریق کی حاجت اس وقت ہوئی جب مسلمانوں کو غاصب کفار کے قبضہ سے خانہ کعبہ کو چھڑانے کے لئے قتال کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح کے احکام کی دوسری مثال نسخ بدعات ہے جو نزول قرآن کے نتیجہ میں واقع ہوا۔ اس کے متعلق فرمایا کہ منافقین اور کھلم کھلا مخالفت کرنے والے یہود کے لئے اس کو آزمائش بنایا گیا۔ سورہ حج میں ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى

اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر شیطان نے اس کے حوصلوں میں

أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ (حج ۵۲، ۵۳)

انکے ڈالے پس شیطان جو کچھ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو منسوخ کر دیتا ہے۔ پھر وہ اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ علم و حکمت رکھنے والا ہے۔ یہ اس لئے کہ شیطان جو کچھ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش بنائے ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور انکے لئے جن کے دل سخت ہو گئے ہیں۔ بیشک ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں۔

یہ ابتلا اسی عام ابتلا کا ایک شعبہ ہے جو زندگی کا مقصود ہے اور اس میں تربیت و تزکیہ کی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

آزمائش کے مقصد سے جو احکام شریعت نے دیئے ہیں ان کو بعض لوگ تعبدی احکام کا نام دے دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی حکمت نامعلوم ہے۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ ان احکام کی نوعیت الگ ہے اور جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے اندر ابتلا کا کوئی مقصد پوشیدہ ہے تو اسی پر اکتفا کرنا چاہیئے اور ہر وہ حکمت ان کے تحت داخل نہ کرنی چاہیئے جو ہم پر مخفی ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس نوعیت کے احکام چند ایک ہیں اور ان میں سے بیشتر کسی خاص وقت سے متعلق ہیں مثلاً حِطَّۃٌ کہنے کا حکم، نہر کا پانی پینے سے روکنے کا حکم اور سابق شریعتوں کی منسوخی۔ کامل و دائم شریعت ایسے احکام کی متقاضی تھی جن کا فائدہ دائمی ہو۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گذشتہ اُمتوں کے وہ احکام ساقط کر دیئے جن میں فائدہ کم تھا اور جو محض ترغیب و تحریص کے مقصد کے تحت نازل کئے گئے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (مائدہ ۶)

اللہ تمہارے اوپر تنگی کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک کرنا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر گزار ہو۔

مرسلہ رحمٰن اکرم
امین احسن اصلاحی

عقائد و عبادات کا تعلق تعمیر سیرت سے

جولائی ۱۹۶۳ء کے میثاق میں تفسیر کی جو قسط شائع ہوئی ہے اس میں آپ نے سیرت و کردار کو عقائد و عبادات کا مقصد اعلیٰ قرار دیا ہے۔ اس سے قبل تفسیر ہی کی ایک قسط میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ انبیاء کرام کے مشن کا منتہا یہ ہے کہ وہ تزکیہ نفوس کرتے ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو کیا ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد سیرت و کردار کی تعمیر قرار دینا صحیح ہوگا، جبکہ عام تصور یہ ہے کہ آیت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ کی رُو سے انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے؟

موجودہ نفسیات کی روشنی میں انسان کا مقصد حیات یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی شخصیت (Personality) کی تعمیر (Development) کرے۔ علمائے نفسیات کے نزدیک لفظ "شخصیت" آدمی کے نظریات و اعمال سب پر حاوی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک "تعمیر شخصیت" کا مفہوم گویا یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نظریات و عقائد اور اپنے اعمال و افعال میں بہتر سے بہتر مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ اسلام میں عقائد و عبادات کا مقصود اعلیٰ اگر سیرت و کردار ہے تو کیا دور حاضر کے علمائے نفسیات کی مذکورہ تعریف سے آپ اتفاق کرتے ہیں؟

جواب :- یہ بات کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے، اس بات سے تضاد نہیں رکھتی کہ انبیاء کی بعثت کا مقصود تزکیہ نفوس ہے یا یہ کہ عبادات و عقائد سے مقصود اعلیٰ سیرت و کردار کو نشوونما دینا ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔

خدا کی عبادت اس اعتبار سے تو بلاشبہ انسانی زندگی کا اصل نصب العین ہے کہ سب سے بڑا حق واجب ازروئے عقل و فطرت و ازروئے دین و شریعت انسان پر یہی ہے۔ لیکن یہ حقیقت آپ جیسے اصحاب فکر و نظر سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ خدا کی عبادت اس لئے مطلوب نہیں ہے کہ خدا اس کا محتاج ہے بلکہ اس لئے مطلوب ہے کہ ہم اس کے محتاج ہیں۔ اسی چیز سے ہماری زندگی کو حقیقی ارتقاء کے لئے وہ سہارا ملتا ہے جس سے ہماری وہ تمام عقلی و روحانی اور تمام علمی و عملی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں جو ہمارے اندر قدرت نے ودیعت کی ہیں۔ اگر یہ سہارا میسر نہ آئے تو اول تو ہماری زندگی کی اصلی صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر کے رہ جاتی ہیں۔ اور اگر کچھ پھیلتی بھی ہیں تو غلط سہارے پکڑ لینے کے سبب سے بالکل غلط سمتوں میں پھیل جاتی ہیں۔ اگر عبادت الٰہی (واضح رہے کہ عبادت کا لفظ میں اس کے حقیقی اور وسیع معنوں میں لے رہا ہوں) اصلی نصب العین کی حیثیت سے پیش نظر رہے تو زندگی اس قسم کی کوتاہیوں اور کجرویوں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اس پودے کی مانند پروان چڑھتی ہے جس کو زمین اور فضا دونوں سے بھرپور غذا حاصل ہو رہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام تزکیہ نفوس کی جو خدمت انجام دیتے ہیں اس میں ان کا پہلا کام ہوتا ہے کہ وہ ہماری زندگی کے رخ کو خدا کی طرف سیدھا کرتے ہیں۔ اس کو صحیح کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے عقائد و نظریات ہر قسم کی کجرویوں اور ضلالتوں سے بالکل محفوظ ہو کر توحید خالص کی چٹان پر اس طرح قائم ہو جائیں کہ فساد علم و نظر کی کوئی آندھی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ دوسری یہ کہ ہمارے اعمال و اخلاق جذبات و خواہشات کی اندھی پیروی سے آزاد ہو کر اعلیٰ عقائد و نظریات یا بالفاظ دیگر ہمارے اصلی نصب العین (خدا پرستی) سے بالکل ہم آہنگ ہو جائیں۔

اس روشنی میں دیکھئے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آ جائے گی کہ انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کا رخ پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف ہو جائے اس نصب العین

کے حصول میں عقائد وعبادات انسان کے سب سے بڑے معاون ہیں اور چونکہ ان میں سے کسی چیز کو بھی اس لئے ضروری نہیں ٹھہرایا گیا ہے کہ خدا کو اس کی ضرورت ہے اس لئے کہ خدا ہر قسم کی ضرورت سے مستغنی ہے۔ اس وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان ساری چیزوں سے خود انسان ہی کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے اور ان عقائد وعبادات سے وہ اپنے آپ کو ان مکارم اخلاق سے آراستہ کرتا ہے جو اس کو مخلوق اور خالق دونوں سے صحیح نسبت بخشنے والے ہوتے ہیں۔

آپ نے علمائے نفسیات کے جس نقطہ نظر کا حوالہ دیا ہے بجائے خود اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ بات تو قرآن میں بھی ہے کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس یا بالفاظ دیگر اپنی ذات اور شخصیت کی اصلاح و تعمیر ہی انسان کا اصل مقصد ہونا چاہیئے۔ یہی چیز ہے جس کے متعلق قیامت کے دن اس سے مؤاخذہ ہونا ہے اور اسی چیز سے متعلق اس کو ایک حد تک اختیار ملا ہوا ہے البتہ یہ سوال ہمارے اور ان علمائے نفسیات کے درمیان اختلافی اور نزاعی ہے کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر کا یہ نصب العین حاصل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہی ہے کہ اس کا صحیح طریقہ وہی ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ایسا نہیں ہے جو خطرات سے محفوظ ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب تزکیۂ نفس میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے امید ہے وہ آپ نے پڑھی ہوگی۔

مقالات

چوہدری محمد اسلم صاحب چیمہ

ہبہ علی الاولاد کے مسئلہ پر ایک نظر

ہمارے ملک میں مدت سے شریعت ایکٹ نافذ ہے جس کی رُو سے تقسیم وراثت میں شریعت اسلامی کی ہدایات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ شریعت ایکٹ کے نفاذ سے قبل انگریزی قانون کے تحت لوگوں پر تقسیم وراثت کے سلسلہ میں اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہ تھی، وہ جس طرح چاہتے تھے اپنی اولاد میں جائداد کو تقسیم کرتے تھے۔

مدتوں تک ہندو رسم و رواج سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہمارے بعض مسلمانوں میں بھی یہ جاہلی تصور پیدا ہوگیا کہ ترکہ میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں اور تمام جائداد مرنے والے کی اولاد ذکور ہی میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ حالانکہ اسلامی شریعت اپنی اس تعلیم میں بالکل واضح ہے کہ ترکہ میت کی لڑکیوں اور لڑکوں میں ایک مخصوص نسبت سے تقسیم ہوگا اور اس نسبت سے الگ کسی اصول کو مشعل راہ بنانے کا مطلب حدود اللہ کو توڑنا ہے۔

شریعت ایکٹ کے نفاذ کے باوجود بعض لوگ اپنے ان جاہلی تصورات کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے لڑکیوں کو جائداد کے حصہ سے محروم کرنے کے لئے حیلہ سازی کا سہارا لیا ہے۔ اس مقصد کے لئے فقہا کا یہ اصول کہ "ہبہ علی الاولاد اگرچہ عند اللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے" ان لوگوں کے ہاتھوں میں ایک حربہ کا کام دے رہا ہے۔ وہ اپنی زندگیوں ہی میں اپنی جائداد کو اولاد کے درمیان اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ شریعت ایکٹ کا سامنا کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہبہ کی صورت میں اولاد کے درمیان اس طرح کا ترجیحی سلوک اسلامی

صول عدل کے بالکل منافی ہے۔ حصوں کی کمی و بیشی یا بعض اولاد کی محرومی سے ایک طرف قطع رحم کا
نا لازم آتا ہے اور دوسری طرف قریبی اور رحمی رشتوں کے درمیان فساد کا بیج بو یا جاتا ہے جس کے نتیجہ
ین بھائی بھائی کا دشمن ہوجاتا ہے۔

ہبہ علی الاولاد میں عدم تسویہ (عدم مساوات) سے بے شمار قباحتیں رونما ہوتی ہیں جو انتہائی سنگین،
ابل مواخذہ اور ناقابلِ برداشت ہیں۔ اس لئے ہبہ علی الاولاد کے قانون کا گہری نظر سے مطالعہ
ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے صاحب جائداد کو جائداد پر تصرف کے وسیع اختیارات
ے رکھے ہیں اور غیر اسلامی قوانین کے بالمقابل اسلامی قانون کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ لیکن
س اختیار کا مطلب یہ ہے کہ مالک جائداد اپنی جائداد میں بیع یا رہن کے ذریعہ تصرف کر کے اپنی ذاتی
ضروریات پوری کر سکے اور ورثا اُسکی راہ میں حائل نہ ہوں۔ یا اگر وہ کسی غیر وارث کو بطور عطیہ کچھ دینا
چاہے تو دے سکے، ورثا اُس کے لئے سدِ راہ ثابت نہ ہوں۔ لیکن اختیار کے اس اصول سے ہبہ
علی الاولاد کا وہ حکم نکالنا جس سے شریعت کے مقرر کردہ ورثا کے حقوق ہی میں افراط و تفریط ہونے لگے،
نہ صرف اخلاق سوز ہے بلکہ قرآن کی واضح ہدایت يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (تمہاری
اولاد کے بارے میں اللہ تم کو وصیت کرتا ہے مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہے) کے بھی
منافی ہے۔

اس آیت کا مطلب بالکل صاف ہے۔ جب کوئی صاحب جائداد، اپنی جائداد کو اپنی زندگی
ہی میں اولاد کے حوالے کرنا چاہے تو وہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ کے اصول کو رہنما بنائے گا اور
اگر وہ ترکہ چھوڑ کر مر جائے تو اس کی جائداد کی تقسیم میں بھی اسی قانون پر عمل کیا جائے گا۔ قانونِ الٰہی
نے حقوق کی جو شرح ورثا کیلئے مقرر فرمائی ہے اس کی پابندی کرنا اُس کے لئے اتنا ہی ضروری
ہے جتنا کہ شریعت کے مقرر کردہ دوسرے حدود و قیود کی پابندی کرنا۔ اگر کوئی شخص جائداد
کی تقسیم میں مذکورہ اصول کے بجائے کوئی دوسرا اصول اختیار کرتا ہے تو وہ گویا اپنا شارع اپنی ذات
ہی کو بناتا ہے۔ خدا کے قانون کی موجودگی میں ایک مسلمان کا اسکے بالمقابل اپنی پسند کے مطابق
[illegible] کرنا قانون الٰہی کی سخت خلاف ورزی ہے۔ حدود اللہ کی خلاف ورزی میں اس

سے بڑھ کر جسارت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جس قانون کا شرعاً پابند ہو، اُس کو وہ اپنی پسند کے مطابق تشکیل کرنے لگے۔

اسلامی قانون میں وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس ممانعت کے ذریعہ سے شریعت دراصل ورثا کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی ہے۔ یوں بھی وصیت کا اختیار ایک تہائی مال کی قید کے ساتھ ہے۔ قابل غور بات ہے کہ ایک طرف تو شریعت میں تیسرا حصہ جائداد ورثا کو دینے کی ممانعت ہو اور دوسری طرف ہبہ کے ذریعہ سے تمام جائداد ورثا میں قانونِ شریعت کے علی الرغم بانٹ دینے کا حق حاصل ہو، یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شریعت نے خرابی کا ایک راستہ بند کر کے دوسرا اُس سے بڑا راستہ کھول دیا۔ گویا ورثا کی حق تلفی اگر وصیت کے نتیجہ میں ہو تو ناجائز ہے۔ لیکن اگر ہبہ کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہو تو جائز ہوگی۔ اس طرح کا تضاد انسانی قوانین میں پایا جانا تو ممکن ہے لیکن خدا کی شریعت اس عیب سے مبرا ہے۔ شریعت کا مطلوب اگر ورثا کے حقوق کا تحفظ ہے تو اپنی منشا کے مطابق مال کا اولاد کو ہبہ کر دینا کسی طرح جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مسلمان کا فرض اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کے دین کو تمام ادیانِ باطل پر غالب کرنا ہے لیکن جب ہبہ علی الاولاد کے مسئلہ کو ہمارے معاشرہ میں جواز کی راہ ملتی ہے تو قانونِ خداوندی سے بچنے کی خاطر یہ حیلہ ایک چور دروازے کا کام دیتا ہے اور انجام کار رواج کا قانون خدا کے قانون پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی ایسی صورت جس کے نتیجہ میں مسلمان کا مشن ہی فوت ہو جائے اور وہ اسلامی قانون کے بجائے کسی دوسرے قانون کی اطاعت و وفاداری میں لگ جائے، اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت ایکٹ سے بچنے کے لئے حیلہ سازی کا یہ دروازہ کھولنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس ایکٹ ہی کو سرے سے منسوخ کر دیا جائے اور انگریزی عہد حکومت کی طرح لوگوں کو آزادی دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی وراثت تقسیم کریں۔ حیلہ سازی کے ذریعہ لوگوں کو شرک میں ملوث کرنے سے تو کفر ہی بہتر ہے، کیونکہ قرآن مجید غیر اللہ کے قانون کی اطاعت و وفاداری کو شرک قرار دیتا ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۝ وہ (اللہ) اپنے حکم (قانون) میں کسی کو شریک

(کہف) نہیں کرتا۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ (مائدہ)

کیا وہ جاہلیت کے حکم (قانون) پسند کرتے ہیں، حالانکہ یقین رکھنے والی قوم کے لئے اللہ تعالیٰ سے کونسی ذات بہتر ہے جو حکم (قانون) دے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (مائدہ)

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق اپنا فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے۔

ہبہ علی الاولاد کی صورت حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے نہ صرف ایسے ہبہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسکو واپس لوٹانے کا حکم صادر فرمایا بلکہ ایسی صورت کو ظلم اور بے انصافی قرار دیا، حالانکہ اس معاملہ میں اولاد کے درمیان ترجیحی سلوک سے مقصود صرف بیوی کو راضی کرنا تھا۔

حضرت بشیرؓ بن سعد کی کئی بیویاں تھیں جن سے اولاد تھی لیکن ان کی ایک بیوی عمرہ بنت رواح کا اصرار تھا کہ میرے بیٹے نعمان کو جب تک ایک قطعہ باغ بطور عطیہ نہیں دیا جاتا میں اُس کی پرورش نہیں کروں گی۔ بیوی کی دلجوئی کے واسطے حضرت بشیرؓ نے نعمان کو باغ ہبہ کیا بیوی اس ہبہ کی مضبوطی کے لئے یہ چاہتی تھی کہ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنایا جائے۔ جب معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اسے ظلم پر مبنی قرار دیا اور ہبہ کو واپس لوٹانے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت نعمانؓ جب کچھ بڑے ہو گئے تو والد کو یہ خیال آیا کہ باغ کی بجائے ان کو ایک غلام ہبہ کر دیا جائے اُن کی بیوی کا بھی یہ خیال تھا کہ باغ کی نسبت غلام کی قیمت چونکہ کم تھی اس وجہ سے غلام کے عطیہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بننے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور بعد میں کسی جھگڑے کا احتمال نہ ہوگا۔ جب معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہوئے ہبہ واپس لوٹا دیا۔

آپ کے ارشادات مختلف روایتوں میں یوں ملتے ہیں۔

(۱) اعدلوا بین اولادکم ۔ اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔

(۲) انی لا اشهد علی جور ۔ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔

۳) سووا بینھم۔ ان کے درمیان مساوات برتو۔
۴) فلیس اصلح ھذا۔ یہ ٹھیک نہیں۔
۵) انی لا اشھد الا بالحق۔ میں حق کے سوا کسی چیز پر گواہ نہیں بن سکتا۔
۶) ولبنیك علیك حق ان تعدل بینھم۔ تیرے بیٹوں کا تجھ پر حق ہے کہ تو ان کے درمیان عدل کرے۔

حضور نبی اکرمؐ کے ان ارشادات سے نہ صرف یہ کہ ہبہ علی الاولاد کی قباحتوں کے بیشمار پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اُن دلائل اور وجوہات کی تردید بھی دستیاب ہوتی ہے جو ایسے ہبہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں اس واقعہ کے علاوہ حضورؐ کے سامنے کوئی دوسرا واقعہ پیش نہیں آیا جہاں آپ نے ہبہ علی الاولاد کی کسی صورت کو پسند فرمایا ہو یا کم از کم اس پر خاموشی اختیار کی ہو۔

مزید برآں آیت کلالہ کا شان نزول اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے موقعہ پر جس کے ساتھ ہبہ کی بڑی مناسبت تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک صحابی کو ہبہ کا مشورہ دے سکتے تھے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ کا قانون نازل ہوا۔ چنانچہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوا اور حضورؐ میری عیادت کو تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس مال ہے اور میں کلالہ ہوں۔ یعنی نہ میرے والدین ہیں اور نہ کوئی اولاد۔ بہنیں ہیں۔ اپنا مال بہنوں کو کیونکر تقسیم کروں۔ اسوقت آیت نازل ہوئی جس میں قاعدہ للذکر مثل حظ الانثیین (مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر کا حصہ ہے) کو دہرایا گیا۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث کو بعض فقہا نے محض اخلاقی حیثیت دی ہے اور اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مشورہ قرار دیکر اسکی قانونی حیثیت کو مجروح کیا ہے۔ اپنے اس موقف کے حق میں انہوں نے جو دلائل پیش کئے ہیں اور ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان پر لاتعداد فقہا نے تعاقب لیا ہے۔ اِن سلف صالحین کے جوابات میں دلائل کے اعتبار سے بڑا وزن پایا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر دلیل کی بڑی مسکت تردید متن حدیث سے پیش کرتے ہیں۔ اور جب فقہا کی بات کی تردید حدیث اصل کے الفاظ سے ہو تو فقہا کی پیروی بھی اسی بات میں ہے کہ حدیث کی پیروی کی جائے۔ ہماری اس بات کی تائید ہوگی اگر آپ زرقانی۔ اختیارات ابن تیمیہ۔ مسند امام احمد۔ ذیل الطالب۔ مسک الختام۔

مغنی ابن قدامہ، تحفۃ الاحوذی۔ محلّٰی ابن حزم۔ قسطلانی۔ فتح الباری، طحاوی وغیرہ کتب کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم نیل الاوطار میں سے ہبہ سے متعلق مباحث کا ضروری ترجمہ ذیل میں دیتے ہیں:۔

"جو لوگ عطیہ کے سلسلہ میں اولاد کے درمیاں تسویہ (مساوات) کو واجب سمجھتے ہیں ان کا استدلال حضورؐ کے قول "اِعْدِلُوْا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ" سے ہے، بخاری نے اس کی تصریح کی ہے اور یہی قول طاؤس، ثوری، احمد، اسحاق اور بعض مالکیہ کا ہے۔ ان لوگوں سے یہ بھی مشہور ہے کہ سرے سے عطیہ ہی باطل ہے۔ احمد کے نزدیک عطیہ تو صحیح ہے مگر اس کو واپس کرانا واجب ہے اور یہ کہ عطیہ میں کمی بیشی بھی جائز ہے اگر اس کا کوئی سبب ہو، مثلاً ایک بچہ قرضہ وغیرہ کی وجہ سے دوسروں سے زیادہ محتاج ہو۔ قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ ترجیحی سلوک سے مقصود اگر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا ہو تو پھر تسویہ واجب ہے۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ تسویہ مستحب ہے۔ عطیہ میں کمی بیشی کی جائے تو صحیح مگر مکروہ ہے۔ اور انہوں نے "اِعْدِلُوْا" کے حکم کو استحباب کے معنی میں لیا ہے .... نعمان کی حدیث سے انہوں نے دس طریقوں سے استدلال کیا۔ جن کا جواب حافظ نے فتح الباری میں دیا ہے۔ ہم مفید اضافوں کے ساتھ اسے بیان کریں گے۔

پہلا سوال یہ اٹھایا گیا کہ نعمان کو جو مال ہبہ کیا گیا تھا وہ اُس کے باپ کا سارا مال تھا۔ حافظ نے اس قول کا متعدد صریح احادیث سے تعاقب کیا جن میں بتایا گیا ہے کہ نعمان کو ایک غلام ہبہ ہوا تھا اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "تصدق علی ابی ببعض مالہ" میرے باپ نے اپنا کچھ مال میرے اوپر صدقہ کیا۔

دُوسرا استدلال یوں کیا گیا کہ مذکورہ عطیہ ابھی ادا نہیں کیا گیا تھا بلکہ بشیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف مشورہ کی غرض سے آئے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کرو تو وہ رک گئے۔ اس کا یہ جواب ہے۔ کہ نبی اکرمؐ نے عطیہ کی واپسی کا حکم دیا تھا (فَارْجِعْہُ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ کی ادائیگی ہو چکی تھی عمرہ بنت رواح کا قول بھی یہی ہے کہ "میں اس وقت تک راضی نہیں جب تک تم حضورؐ کو اس پر گواہ نہ کرو۔

تیسرا استدلال یوں تھا کہ اگرچہ نعمان بڑے تھے لیکن انہوں نے ہبہ کے مال کو ابھی اپنے قبضہ میں نہیں کیا تھا۔ اسلئے ان کے والد کے لئے رجوع کرنا ابھی جائز تھا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ بات

اکثر روایتوں کے مضمون کے خلاف ہے۔ خصوصاً لفظ (ارجعہ) یعنی اس عطیہ کو واپس کرو" قبضہ ہو جانے کی دلالت کرتا ہے۔

چوتھی دلیل یہ تھی کہ لفظ ارجعہ ہبہ کی صحت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر ہبہ صحیح نہ ہوتا تو اس کا واپس لوٹانا بھی صحیح نہ ہوتا۔ واپس لوٹانے کا حکم اس لئے دیا کہ باپ کو اختیار ہے کہ بیٹے کے ہبہ کو واپس لے لے اگرچہ افضل اس کے برعکس ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ پھر ایسے ہبہ کو ظلم سے تعبیر فرما کر اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعْدِلُوْا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ کیوں فرمایا، جبکہ باپ اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

پانچواں استدلال یہ کیا گیا کہ حضور کا ارشاد ہے اَشْھِدْ عَلٰی ھٰذَا غَیْرِیْ (اس پر غیر کو گواہ کر لو) اس میں دوسروں کو گواہ کرنے کا حکم ہے۔ آپ نے خود امام ہونے کی وجہ سے انکار فرمایا کیونکہ امام کی یہ شان نہیں ہوتی کہ وہ گواہ بنے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ فیصلہ کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام کی شان میں یہ بات لازم نہیں ہوتی کہ وہ گواہ نہ بنے۔ حق کی گواہی چھپانا ہر ایک کے لئے گناہ ہے خواہ امام ہو یا غیر امام۔ دراصل یہ الفاظ سخت ناراضگی کے موقعہ پر بولے گئے اور حدیث کے باقی الفاظ اس پر دلیل ہیں۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ حضور کا قول " اشہد" صیغہ امر ہے۔ اور اس سے مراد جواز کی نفی ہے یہ اسی طرح کا قول ہے جیسا حضور نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا " اشترطی لہم الولاء" (ان کے لئے ولاء کی شرط لگا) حضور کا اس معاملہ کو ظلم سے تعبیر کرنا بھی اسی کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

چھٹا استدلال یہ تھا کہ حضور کے قول الا سویت بینہم (کیا تو نے ان کے درمیان یکساں سلوک نہیں کیا؟) سے مراد امر مستحب اور نہی تنزیہی ہے حافظ نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ استدلال تسلیم ہو سکتا تھا۔ اگر ان کے علاوہ حضور کے مزید کوئی الفاظ منقول نہ ہوتے۔ بالخصوص سووا بینہم (ان سے یکساں سلوک کرو) کے الفاظ..............

آٹھویں دلیل یہ تھی کہ عطیہ میں اولاد کے مابین مساوات کو ان کے درمیان نیکی کا یکساں سلوک کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ یہ امر مستحب تھا۔ اس کا جواب حافظ نے یہ دیا کہ عدم مساوات پر جور (ظلم) کا لفظ بولنا اور ترجیح یا فضیلت کے طرز عمل سے منع کرنا استحباب پر نہیں بلکہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ پس ان دونوں قرائن کو اپنے اصل سے پھیرنا چاہئے

نہیں۔ ذا س کا مطلب یہ ہے کہ اوامر میں اصل وجوب ہے اور نہی میں اصل حرمت - یہ دونوں اپنے مقام پر رہیں گے جب تک کوئی قرینہ ان کو اپنے اصل مقام سے ہٹا کر امر سے استحباب اور نہی سے نہی تنزیہی مراد نہ لے، یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں)

نواں استدلال یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا حضرت عائشہ کو عطیہ دینا ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے دوسرے لڑکوں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے عاصم کو عطیہ دیا۔ اگر ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو دو خلفاء راشدین یہ غلطی کیوں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو عطیہ دینے پر ان کے بھائی راضی تھے۔ عاصم کے واقعہ میں بھی یہی صورت تھی۔ مزید برآں اصولی طور پر مرفوع حدیث کی موجودگی میں خلفاء کا طرز عمل حجت نہیں ہے۔

دسویں دلیل یہ دی گئی کہ اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ ایسا عطیہ جو آدمی اپنی اولاد کے سوا کسی کو دے وہ جائز ہے اس لئے اگر یہ بات جائز ہے کہ وہ اپنی تمام اولاد کو چھوڑ کر کسی غیر کو اپنے مال کا مالک بنا دے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیئے کہ وہ بعض اولاد کو چھوڑ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نص کی موجودگی میں قیاس کا ضعف مخفی نہیں۔ پس حق بات یہی ہے کہ اولاد کے درمیان تسویہ واجب ہے اور کمی و بیشی کا ترجیحی سلوک حرام ہے۔"

لہٰذا جن بزرگوں نے حدیث مندرجہ بالا کو مشورہ کا مقام دیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ شارع علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مشورے دینے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا تھا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تو قرآن کی اس آیت کے مطابق تھی۔ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ (اللہ پاک وہ ذات ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کر دے) حضورؐ کی اس ذمہ داری کا تقاضا مشوروں سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں بھی حدیث شریف میں مشورہ کا وقوع دو دفعہ ملتا ہے۔ ایک بریرہ لونڈی کے نکاح کے موقعہ پر حضورؐ نے اس کو مشورہ دیا تھا جس پر بریرہ نے آنحضرتؐ سے اس بات کی وضاحت کروالی اور پیروی سے آزاد ہو گئی۔ حضورؐ کا مشورہ اس نے قبول نہ کیا۔ دوسرے کھجور کے درخت کو پیوند لگاتے وقت لوگوں نے حضورؐ کی بات کو حکم سمجھ لیا حالانکہ وہ ایک مشورہ تھا۔ اور اس کو قبول کرنے کا انجام خسارے کی صورت میں رونما ہوا۔ اس پر حضورؐ نے بھی تاسف کا اظہار فرمایا ہے

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ کو قبول کرنے میں آدمی آزاد ہوتا ہے۔ اس میں اتباع کرنا واجب نہیں اس اعتبار سے حضرت نعمان بن بشیر کی حدیث کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بشیر کا ہبہ بار بار واپس لوٹایا گیا۔ اور صحابی رسول اللہؐ نے اس حکم کی ایک امر کے طور پر اتباع کی پھر حدیث کے مختلف الفاظ اور جملے اس کی قانونی حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً عدل کا لفظ قانونی لفظ ہے۔ شہادت اور ہبہ کا مسئلہ قانونی مسئلہ ہے اور ناجائز یا ناحق کے الفاظ قانون سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان سوالات کو وزن نہ دیا جائے تو کسی حدیث کی قانونی یا اخلاقی حیثیت متعین کرنے کے لئے آخر اور کونسی کسوٹی ہے ؟

اگر یہ حدیث قانونی حیثیت نہیں رکھتی تو پورے ذخیرہ حدیث اور کچھ حصہ قرآن کی بھی قانونی حیثیت مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جو لوگ اس حدیث کو مشورہ کا مقام دیتے ہیں، وہ نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ زندگی میں اولاد کو جائداد ہبہ کرنا عنداللہ گناہ ہے مگر جائز ہے۔ یہ تاویل دراصل گناہ کو جائز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ حالانکہ قرآن مجید نہ صرف گناہ کو بلکہ ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ	اے محمدؐ ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ	حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں۔ بے شرمی کے کام خواہ کھلے
وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (اعراف)	ہوں یا چھپے اور گناہ۔ اور حق کے خلاف زیادتی۔

لیکن بعض فقہا کا موقف نہ صرف گناہ کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اللہ کے مقرر کردہ حقوق پر ہبہ علی الاولاد کے ذریعہ دست درازی کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ اس موقف کے قائل حضرات اسکی جس قدر وکالت کریں اس کی حیثیت لارڈ میکالے کی تعزیرات پاکستان سے مختلف نہیں ہو سکتی جس کی رو سے ایک شادی شدہ عورت اغوا ہو جائے یا بداخلاقی کا ارتکاب کرے اور اغوا کنندہ پر عدالت میں مقدمہ چلے تو استغاثہ اگر یہ ثابت کر دے کہ ارتکاب کنندہ کو معلوم تھا کہ عورت شادی شدہ ہے اور معلوم ہونے کے باوجود اس نے سب کچھ کیا تو وہ قانون کی زد میں آجائے گا۔ لیکن اگر استغاثہ یہ ثابت نہ کر سکے اور ملزم یہ ثابت کر دے کہ اسے عورت کے منکوحہ ہونے کا کوئی

علم نہ تھا تو قانون اُسے بری کر دے گا۔گویا سمجھا جائے گا کہ یہ گناہ تو ہے مگر قانوناً مرد و زن کا یہ فعل جائز ہے۔

لہٰذا اسلامی قانون میں اگر اسی قسم کے رخنے پیدا کر لئے جائیں اور چور دروازوں یا حیلہ سازیوں کی راہ کھول دی جاوے تو یہ اسلامی قانون کی کوئی خدمت نہ ہوگی۔بلکہ یہ صورت اُلٹا اس کی بدنامی اور زوال کا سبب بنے گی۔ یہ اسی طرح کی کیفیت ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ سال گزرنے کو تھا کہ مال بیوی کے نام کر دیا گیا اور دوسرا سال ابھی پورا ہونے نہیں پایا تھا کہ مال میاں نے لے لیا تاکہ نہ سال پورا ہوا اور نہ زکوٰۃ دینا پڑے۔غالباً ایسا کرنا بھی عند اللہ گناہ ہے مگر قانوناً جائز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قانون موم کی ناک ہے کہ جس طرف چاہا موڑ لیا؟ کیا قانون لوگوں کے سامنے بے بس ہے یا لوگ قانون کے سامنے بے بس ہونے چاہئیں؟ کیا قانون ان حیلہ سازیوں کا علاج نہیں کر سکتا؟ اگر قانون کے ہاتھ بند ہوتے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ مانعین زکوٰۃ پر کیسے چڑھائی کر سکتے تھے؟ اور وہ کیا دلیل تھی جس نے حضرت عمرؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کو اس معاملہ میں خاموش کر دیا تھا۔لہٰذا موشگافیوں کے چکر میں پڑنا درست نہیں۔ہم نے یہ مثالیں اس لئے پیش کی ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث کو جن بزرگوں نے مشورہ کا مقام دیا ہے یہ اُن کا سہو ہے۔اور یہ چیز قابل تقلید نہیں بلکہ قابل اصلاح ہے۔اور اس کے برعکس جن حضرات نے اس حدیث کو قانون کا مقام دیکر ایسے ہبہ کو باطل قرار دیا ہے اور عدالت کو ایسے ہبہ کے توڑنے کا حق دیا ہے وہ بالکل درست ہے اور منشاءِ شریعت کے عین مطابق ہے۔

حضورؐ کو اپنے ایک صحابی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کا تعلق صرف بیوی کو خوش کرنے کی حد تک تھا۔لیکن آج کل جو صورت حال رونما ہو رہی ہے اس کے نتیجہ میں معاشرہ اسلامی قانون کی وفاداری کے بجائے ہندو رواج کو پسند کر رہا ہے اور لوگ نہیں چاہتے کہ لڑکیاں اُن کی جائداد کی وارث ہوں۔ایسی صورت کو بھلا اسلام کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ حضورؐ کے سامنے اگر ایسے حالات کا ظہور ہوتا تو آپ اس مشرکانہ معاملہ کا بڑا سخت نوٹس لیتے۔جن فقہا نے ہبہ علی الاولاد کو جائز کہا ہے۔ اگر اُن کے سامنے بھی موجودہ صورت حال رونما ہوتی تو وہ بھی لازماً اسے حرام قرار دیتے۔ہمارے فقہائے عظام تو بار بار اپنی کتابوں میں لکھ چکے ہیں کہ حدیث

رسول اللہؐ کے مقابلہ میں ہماری بات کو دیوار پر دے مارو۔ لہٰذا اس معاملہ میں اُن پر تو کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ البتہ ہم لوگ عنداللہ مجرم قرار پائیں گے جو عبرت نہیں پکڑتے۔

اُوپر کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاد میں سے بعض کے حق میں باستثنائے دیگر ہبہ کرنا سراسر قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ یہ نہ صرف گناہ ہے بلکہ قطعی طور پر حرام ہے۔ ہمارے مروجہ قانون کی نظرثانی ہونی چاہیئے۔ علمائے اسلام کو اس کے خلاف آوازِ حق بلند کرنی چاہیئے تاکہ ہماری عدالتیں اس پہلو پر غور و خوض کر کے "قانون ہبہ در بارہ بعض اولاد باستثنائے دیگراں" کی صحت کر سکیں۔

بقیہ مضمون صفحہ نمبر ۵۶

رُوح القرآن

فاضل مصنف کے عنوانات "امن خمسہ" اور "قل خمسہ" اگرچہ دلچسپ ہیں لیکن عام قارئین کی سمجھ سے شاید بالاتر ہوں گے۔ کتاب کے شروع میں مشکل اور اصطلاحی الفاظ کا ایک فرہنگ بھی دیا گیا ہے جس میں الفاظ کے معانی کے تمام اطراف دے دیئے گئے ہیں حالانکہ کتاب میں جہاں کہیں وہ الفاظ بیان ہوئے ہیں ان سے مراد ان کا کوئی خاص پہلو ہے۔

کتاب اچھے کاغذ پر بلاک کے ذریعہ سے چھپی ہے اور مجلد ہے۔ آیات کا عربی متن اس میں نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ ناشرین کی طرف سے یہ اعلان اس میں موجود ہے کہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں عربی متن کا اضافہ کر دیا جائیگا۔

(خ - م)

اقتباسات و تراجم

جناب محمود احمد صاحب

آزادی اور غلامی

آزادی نہ تو، عامیانہ تصور کے مطابق، کسی گروہ کے ترقی وسیادت کے حصول کا نام ہے کیونکہ یہ تو محض سیاسی آزادی ہوئی جبکہ قوم کی فکری، ثقافتی اور نظریاتی آزادی کی منزل اس سے کہیں آگے ہے۔ اور نہ ہی آزادی، جوانوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق، انسان کے اپنی خواہشات کے پیچھے بگٹٹ بھاگنے کا نام ہے کہ وہ جو چاہے کھائے اور جو چاہے کرے اور جس چیز کی خواہش کرے اس کے حصول کے لئے بلا تکلف تگ ودو کرسکے کیونکہ ایسی آزادی کی ابتداء بدنظمی اور انتشار ہے اور اس کی انتہا ایک گھٹیا قسم کی غلامی ہے۔

جہاں تک آزادی کے بدنظمی اور انتشار ہونے کے پہلو کا تعلق ہے، یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ دنیا میں مطلق آزادی کا، جو کسی نظام اور قانون کی پابند نہ ہو، تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں ہر شے ایک قانون اور ضابطے میں بندھی ہوئی ہے۔ چنانچہ فرد کی آزادی کی ضمانت اس وقت تک نہیں دی جاسکتی جب تک کہ اسے بعض پابندیوں میں نہ جکڑ دیا جائے تاکہ اس جیسے دوسرے افراد کی آزادی بھی محفوظ و مامون کی جاسکے۔ قوانین، دساتیر، شریعتوں اور نظاموں کی عائد کردہ پابندیوں کی حکمت بھی اسی میں مضمر ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے بڑے شہروں کے ٹریفک کے قوانین کو لیجئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص شاہراہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی اندھا دھند چلا سکے؟ راحت عامہ کے قانون کی مثال لیجئے، کیا کسی کو اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ آباد سڑکوں پر آدھی رات کے بعد راگ الاپتا دندناتا پھرے؟

سیفٹی قوانین پر غور کیجئے، کیا ملک کے کسی باشندے کو ایسی آراء کی نشرو اشاعت کی اجازت دی جاسکتی ہے جو ریاست کے امن و امان کو غارت کرنے والی اور اس کی سلامتی کے لئے خطرہ بننے والی ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دشمن سے صلح کی دعوت دینے کی جرأت کرسکے درآں حالیکہ اس کی قوم اور اس دشمن کے درمیان گھمسان کا رن بپا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دشمن کے ساتھ تجارت کرے اور اپنے ملک کے مال مویشی اس کی طرف ہنکا دے اور اسے عبرتناک سزا نہ دی جائے حتیٰ کہ سزائے موت سے بھی دریغ نہ کیا جائے؟ آزادی کی تکمیل تمام پابندیاں دور کر دینے اور آزادی کو انتہا تک پہنچانے سے نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات پابندیاں ہی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مریض کو کھانے پینے کی مکمل آزادی لوٹانے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ، وقتی طور پر، ان اغذیہ کے استعمال پر پابندی لگا دی جائے جن سے ضرر کا اندیشہ ہو یا پھر جس طرح مجرم سے وقتی طور پر اس کی آزادی چھین لینے سے مقصود اسے آزادی کے صحیح استعمال کی تربیت دینا ہوتا ہے تاکہ آئندہ نہ وہ اپنے لئے کوئی فتنہ کھڑا کرے اور نہ معاشرے ہی کو ایذاء دے۔

مزید برآں انسان کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر رہ سکے۔ اسے لازماً ایک مربوط معاشرے کے جزو کی حیثیت سے رہنا پڑتا ہے جس کا ہر حصہ دوسروں کو ایذاء پہنچا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک عمدہ تمثیل سے سمجھا جا سکتا ہے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔

آپ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار تھے، ایک گروہ بالائی اور دوسرا زیریں حصے میں تھا۔ نیچے والے اوپر والوں سے اپنے لئے پانی حاصل کیا کرتے۔ اسی دوران میں انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ وہ کشتی کا پیندا چھید ڈالیں اور براہِ راست سمندر سے پانی حاصل کر لیا کریں تاکہ اوپر والوں کا زیرِ بارِ احسان نہ ہونا پڑے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اس موقع پر اوپر والوں نے نیچے والوں کو من مانی کرنے کی آزادی دے دی تو سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا تو سب بچ رہیں گے۔ انسانیت کے معلم اکبر نے اس دلنشین تمثیل سے وہ حدِ فاصل متعین کر دی ہے جو اس شخصی آزادی کو جو اپنے اندر دوسروں کے لئے ضرر کا

کوئی پہلو مخفی ہو، اس آزادی سے الگ کر دیتی ہے جس کے من ملنے استعمال سے معاشرے کو ایذا پہنچے اور اسے ہلاکت کا سامنا کرنا پڑے۔

جہاں تک ایسی شتر بے مہار آزادی کے فی الحقیقت غلامی ہونے کا تعلق ہے تو کامل آزادی کا پیمانہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ دُنیاوی اعتبار سے کسی کا ہم پلہ یا اس سے فروما یہ شخص اسے اپنی غلامی کے بندھنوں میں نہ جکڑ سکے۔ اور انارکی اور انتشار کی وہ حالت، جسے بعض لوگ شخصی آزادی سے تعبیر کرتے ہیں، اپنے جیسے یا اپنے سے فروتر انسانوں کی غلامی کی ایک مکروہ شکل ہے۔

جب آدمی پر ہر لذت کے پیچھے بھاگنے کی عادت غلبہ حاصل کر لیتی ہے اور وہ اس بھاگ دوڑ میں ہر پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے، اس وقت لذت اپنی غلامی کا دامن پھیلا کر اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے اور وہ اس کا اسیر بن کر ہر قدم اسی کے ارادے اور تحریک کے تحت اٹھاتا ہے اور وہ جو چاہتی ہے اس سے کرواتی ہے حتیٰ کہ وہ اس کے بندھنوں میں اس بُری طرح جکڑا جاتا ہے کہ پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی استطاعت کھو دیتا ہے۔ آخر یہ آزادی کی کون سی قسم ہوئی جو زندگی کی کم قیمت اور بے معنیٰ اقدار کی کھلے بندوں بندگی کا روپ دھار لیتی ہے؟ اگر انسان کی قدر و قیمت اس کے لذائذ سے بہرہ اندوز ہونے کی مقدار کی نسبت سے ہوتی تو حیوانات یقیناً اس سے زیادہ قابلِ قدر محسوب ہوتے کیونکہ وہ اپنی لذات کی طلب و سعی میں کسی قید یا مقصد کے پابند نہیں ہوتے۔ درآنحالیکہ انسان کو اپنی مرغوب لذائذ کے حصول کی راہ میں، اپنی خواہش کے باوجود، چند در چند رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کے اور اس کی مرغوبات کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔ کیا اس صورت میں کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ حیوان جس پر حصولِ لذات کی راہ میں کوئی پابندی حائل نہیں ایک انسان سے زیادہ آزاد اور اس کے تعبیر میں اس سے زیادہ خوش بخت ہے؟

اور کیا وہ شخص جو کسی عورت پر فریفتہ ہو یا ان حسیناؤں کے پیچھے سرگرداں رہتا ہو جن سے وہ اپنی مرغوباتِ نفس پوری ہونے کی توقع رکھتا ہو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ان کے اقتدار سے آزاد ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ اپنے محبوب کے ہجر یا ہجر کے بعد وصال کے سبب سے اس کی ہر ادا کا اسیر، ہر اشارے کنائے کا مرہون، خود اپنی عقل سے بدگمان اور عزیز زندگی تک سے

بیزار ہو جاتا ہے؟ اس سے زیادہ ذلیل غلامی بھلا کیا ہوگی کہ آدمی محبت و نفرت، تعلق و قطع تعلق رضا و غضب اور آرام و اضطراب کے معاملات میں کسی کی مرضی کا پابند ہو؟

اور جب انسان مسکرات سے رغبت پیدا کرلیتا ہے تو ہر جام اس کے لئے بے شمار خرابیوں کی راہیں کھول دیتا ہے۔ اور بالآخر اس کے اعصاب مفلوج، اس کی صحت برباد اور اس کی عقل و شرافت سلب ہو جاتی ہے۔ کیا وہ اس حالت میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ آزاد ہے؟ کیا اس جہان میں شرابِ ناب کی سی قاتل اور مہلک شے کی غلامی سے بدتر غلامی کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے؟

یہی حال مال و جاہ پر جان دینے اور وطن اور قوم کے لئے تعصب رکھنے والوں کا ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر جذبہ جب آدمی پر چھا جاتا ہے تو اسے اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ خواہشاتِ نفس کو مغلوب کر لیتی ہیں یہاں تک کہ اعمال اور اخلاق ان کے زیرِ حکم آ جاتے ہیں اور وہ ایسی بدترین غلامی کے گڑھے میں انسان کو جا گراتی ہیں جس کی قباحت کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ قرآنِ مجید نے نہایت عمدہ اسلوب میں اس حالت کی تعبیر کی ہے فرمایا

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ — بھلا دیکھو تو اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا۔ (الجاثیۃ ۲۳)

خواہشِ نفس اس طرح کے لوگوں کے لئے وہی درجہ رکھتی ہے جو کہ مؤمنین کے لئے الٰہ حقیقی کا ہے آخر الٰہ اسی کو تو کہا جاتا ہے جس کو پوجا جاتا ہو اور جس کی اطاعت کی جاتی ہو، جس سے ڈرا جائے اور جس سے اُمید رکھی جائے کیا یہ سچ نہیں کہ خواہشِ نفس کے بندے اپنی خواہشات کے سامنے سرافگندگی اختیار کر لیتے ہیں، پسند اور ناپسند میں ان کا معیار قبول کر لیتے ہیں اور ان کے لئے ان شہوات کی ناراضگی مول لینا یا ان کی پسندیدہ راہ سے ہٹنا ناممکن ہو جاتا ہے؟

غلامی محض قید و بند کو نہیں کہتے کیونکہ یہ تو غلامی کی سہل ترین قسموں میں سے ہے جو بہت جلدی جاتی رہتی ہے، غلامی تو درحقیقت اس عادت کی ہوتی ہے جو جڑ پکڑ لے یا پھر اس شہوت کی ہوتی ہے جو سر پر سوار ہو جائے اور اس لذت کی ہوتی ہے جس کی اطاعت سے کنارہ کشی ممکن

ہو۔ اسی طرح آزادی محض نقلِ مکان پر قدرت رکھنے کو نہیں کہتے کیونکہ یہ آزادی کی سب سے ادنیٰ اور کم قیمت قسم ہے، حقیقی آزادی تو یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات اور وساوسِ نفسی پر قابو رکھتا ہو، کوئی عادت اسے اپنا اسیر نہ بنا سکے اور کوئی شہوت اسے سپر ڈالنے پر مجبور نہ کر سکے۔

دیندار اور حقیقی مومن اسی معنی میں آزاد تھے اور ان کی آزادی غیر محدود تھی۔ دینِ حق نے انہیں طمع، خواہشات اور شہوات کے غلبے سے چھڑا لیا تھا، ان کے نفوس کو خالقِ کون و مکان سے جوڑ دیا تھا اور ان کے ارادے کو اسی کے ارادے کا پابند بنا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی تمام خیر اور محبت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔ پس جسے حق اور خیر اور رحمت اپنی غلامی سے سرفراز کریں بھلا وہ ان سے متضاد مذموم صفات کا غلام رہ سکتا ہے؟

جب کیفیت یہ ہے کہ انسان کو کسی نہ کسی فکر یا وسوسے یا عادت کی بندگی سے مفر نہیں تو وہ لوگ جنہیں حق تعالیٰ اپنی بندگی میں لے لے ان لوگوں سے یقیناً افضل ہیں جنہیں باطل کی غلامی سے دوچار ہونا پڑے۔ اور وہ لوگ جن پر ایسے اعلیٰ انسانی محرکات کا غلبہ ہو کہ جن کا منبع خود ذاتِ باری ہے ان لوگوں سے یقیناً افضل ہیں جنہیں کوئی شہوانی محرک جس کا ناتا شیطان سے جا ملتا ہو، اپنا مطیعِ فرمان بنا لے۔ اور وہ لوگ جو خدائے تعالیٰ کے سامنے سر فگندہ ہوں اور اس کے امر و نہی کی پابندی کرتے ہوں ان لوگوں سے افضل، اکمل اور دور اندیش ہیں جو مال، لذت، تنِ بازاری یا جامِ ارغوانی کے سامنے سپر ڈال دیں۔ اس کی روشنی میں ان تمام نہاد ترقی پسندوں کی حماقت ملاحظہ کیجیئے جو لوگوں کو اس سے روکتے ہیں وہ انہیں عبد اللہ یا عبد الجواد کی قسم کے ان ناموں سے پکاریں جو ان کے ماں باپ نے رکھے تھے۔ یہ لوگ بزعم خویش اپنے آپ کو عبودیت سے متصف کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ کیا انہی لوگوں کو تم نہیں دیکھتے کہ اس ہستی کی غلامی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں جس کے اقتدار سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں لیکن اس کے بدلے کسی حقیر سی شہوت یا معمولی سی رغبت کی بندگی کا قلادہ بخوشی گلے میں ڈال لیتے ہیں؟

وسیع تر معنوں میں آزادی انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی بندگی میں شدید تر ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی حسینہ فریفتہ نہیں کر سکتی، کوئی شہوت قابو میں نہیں لا سکتی، کوئی قسم

کامال انہیں اپنی چاکری پر مجبور نہیں کرسکتا، کوئی لذت ان کی ذکاوت اور ہوش و خرد کو ضائع نہیں کرسکتی، کوئی طمع یا بے قراری ان کے وقار اور عزتِ نفس کو گزند نہیں پہنچا سکتی اور کوئی خوف یا مصیبت انہیں نیچا نہیں دکھا سکتی۔ خدائے واحد کی بندگی انہیں ماسوا اللہ کے خوف سے نجات دلا دیتی ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۔ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۔ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ[۵] (یونس ۶۲-۶۴)

اللہ نے سچ فرمایا۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کی برکت سے غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے بچ رہتے ہیں اور یہی لوگ عزتِ نفس کے مالک، حقیقی معنوں میں آزاد، دل کے غنی اور اخلاق میں بلند ہوتے ہیں۔ میری جان کی قسم یہ عظیم آزادی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا تھا کہ "تونگری کثرتِ مال سے نہیں بلکہ دل کی تونگری سے ہے" (بخاری، مسلم) اور ابنِ عطاء کا کیا ہی اچھا قول ہے کہ "جس سے تجھے کوئی اُمید نہیں، اس سے تو آزاد ہے اور جس کی تو طمع رکھتا ہے اسی کا بندہ ہے۔"

اُوپر حریت اور عبودیت کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کی روشنی میں عظیم صوفی شیخ احمد بن خضرویہ کے اس قول کی بلیغ حکمت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ "آزادی میں تیری غلامی ہے اور سچی بندگی میں مکمل آزادی"۔

(البعث الاسلامی)

[۵] "سن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔ ان کے لئے دُنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا کے ملفوظات میں تبدیلی نہیں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔"

رُوحُ القرآن

تالیف : آچاریہ ونوبا بھاوے

صفحات : ۳۸۴

قیمت : ۴ روپے

ناشر : اکھل بھارت سرو سیوا سنگھ پرکاشن ۔ راج گھاٹ کاشی (انڈیا)

ھندوستان کی بھودان تحریک کے لیڈر آچاریہ ونوبا بھاوے کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ آپ گاندھی جی کے رفقاء میں سے ہیں اور ان کے پیغام اور طریق کار کے علمبردار ہیں ۔ بھاوے جی کے نزدیک انسان اور انسان کے درمیان ہمدردی ، تعاون اور اخوت کا سلوک ہونا چاہیئے نہ کہ بغض و عداوت کا ۔ اس لئے انہوں نے مختلف مذاہب کے پیرووں کو قریب تر لانے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے ۔ زیر نظر کتاب کی تمہید میں فرماتے ہیں ،

" سائنس نے دنیا چھوٹی بنائی اور سب انسانوں کو نزدیک لانا چاہتا ہے ۔ ایسی حالت میں انسانی سماج فرقوں میں بٹا رہے ، ہر جماعت اپنے کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھے ، یہ کیسے چلے گا ؟ "

ہمارے نزدیک بھاوے جی کی یہ کوشش قابل تحسین ہے ۔ آخر کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ انسان جو مادی حقائق کو جاننے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے اور ایسی ایسی شعبدہ بازی کرتا ہے کہ آدمی انگشت بدنداں رہ جائے ، اپنے عقیدہ و عمل اور اخلاق و کردار کے معاملے میں حقیقت شناسی کے جوہر بالکل نہیں دکھاتا ۔ زندگی کے اس گوشے میں اس کا استدلال غیر منطقیانہ اور اس کے مزعومات خلاف عقل ہوں تو اس کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت اور فاصلے کی سابقہ تعبیروں میں عظیم تبدیلی آجانے کے باوجود انسان

آج تک تفریق وانتشار کی دلدل سے نہیں نکل سکا۔ ہمارے نزدیک ہر وہ کوشش قابل قدر ہے جو انسان کو حقیقت شناسی کی طرف بلائے۔

اہل مذاہب کے دلوں کو جوڑنے کے اس مقصد کے تحت بھاوے جی نے پہلے دھم پد اور گیتا پروچن نامی دو کتابیں لکھیں جن میں ہندومت کی بنیادوں کو اجاگر کیا۔ اب اسی مقصد کے تحت آپ نے زیرِ نظر کتاب تالیف کی ہے جس میں قرآن مجید کی ۱۰۶۵ آیات کو ۴۰۰ عنوانات کے تحت اور ان عنوانوں کو نو قطعات میں قلمبند کیا ہے۔ ان قطعات کے نام اور ترتیب یہ ہے ادخال بہ کتاب ۔ اللہ ۔ عبادت ۔ عابد وملحد ۔ اعتقادِ دین ۔ اخلاق ۔ انسان اور اس کی فطرت ۔ رسول ۔ سربستہ رازوں کی طرف اشارہ ۔ ان قطعات میں بھاوے جی نے وہ تمام آیتیں جمع کی ہیں جن کے متعلق وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ وہ روح قرآن کو پیش کرنے والی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ روح قرآن کو اخذ کرنے کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے، تو ہمارا خیال یہ ہے کہ مصنف نے ہماری توقع سے زیادہ قرآن کے فلسفہ اور دین کی بنیادوں کو پیش کیا ہے۔ قطعات کے مذکورہ ناموں ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تینوں بنیادوں ؛ توحید، رسالت اور آخرت کو کتاب میں مناسب نمائندگی دی گئی ہے تاہم انتخاب حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض جگہ تو مصنف نے قرآن کی آیات سے اپنے نظریات کی تائید کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس کے برعکس قرآن کے بعض اہم مباحث کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر فاضل مصنف نے سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا کے الفاظ سے حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے "برہمچاری" ہونے کا نتیجہ تو نہ صرف اخذ کیا بلکہ اسے روحِ قرآن میں شمار کیا لیکن دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو نمایاں کرنے والی اہم ترین آیت

هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت
بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ	اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ	دوسرے تمام ادیان پر غالب کرے، اگرچہ
الْمُشْرِكُوْنَ ۝	مشرکین ناپسند کریں۔

... کتاب میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔

اسی طرح "مذہبی رواداری" کے عنوان کے تحت انہوں نے وہ آیتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر صرف بعید ترین مناسبتوں سے ہی کیا جا سکتا تھا اور جہاں تک مسلمان عارفین کا تعلق ہے وہ ان آیات کو قطع علائق اور اظہار بیزاری کی آیتیں سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے ان تمام مضامین سے صرف نظر کیا ہے جن میں مسلمانوں کو ان لوگوں سے حرب و قتال وغیرہ کی تلقین کی گئی ہے جو خدا کی زمین میں فساد پھیلانے والے اور اہلِ ایمان پر عرصہ حیات تنگ کرنے والے ہیں۔
اس رد و قبول کی وجہ آخر اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ بھاوے جی کے ذہن میں جو فلسفہ ہے اس سے موافقت رکھنے والی آیات تو انہوں نے پیش کر دیں لیکن جو آیات اس کی مخالف تھیں ان کو انہوں نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔

مصنف نے عابدین کی خصوصیات بتانے کے لئے جو آیات جمع کی ہیں ان سے انہیں معاف کرنے والے، سخی، باہمی مشورے سے کام کرنیوالے اور تعلقات کو جوڑنے والے ثابت کیا ہے اور اس باب کا عنوان لگایا ہے "اہنسا پسند"۔ اگر اہنسا انہی صفات کی تعبیر ہے تو ہمیں اس عنوان پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر مصنف کے نزدیک اہنسا سے مراد وہ فلسفہ ہے جو گاندھی جی نے پیش کیا اور اس کے وارث فاضل مصنف خود ہیں تو ہم ادب سے گذارش کریں گے کہ بیان کردہ آیات کا اس عنوان سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

"روح القرآن" کی تیاری میں مصنف نے بڑا اہتمام کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہ رہ جائے لیکن اس کے باوجود شاید ترجمہ لکھنے والوں کی کوتاہی کی وجہ سے صفحہ ۶۶ پر عِنَبًا وَّقَضْبًا کا اور صفحہ ۲۶۷ پر وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔ صفحہ ۲۹۶ پر مصنف نے ایک عنوان قائم کیا ہے "مخالف حالات میں ہدایت کرنے والے" اور یہ صفت رسولوں کی بیان کی ہے حالانکہ اس کے تحت انہوں نے جو آیت بیان کی ہے قرآن اس سے مصلحین کی جماعت مراد لی ہے ـــــ صفحہ ۱۰۰ پر لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ کا ترجمہ "خدا کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے" اور صفحہ ۱۱۹ پر أَتْقَاكُمْ کا ترجمہ "زیادہ ادب والا" بھی محلِ نظر ہیں۔

(باقی بر صفحہ نمبر ۴۷)